ماہنامہ

حکمۃ قرآن

لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

استقبالِ رمضان

رمضان المبارک کی آمد پر
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خطبہ

عَنْ سَلْمَانَ الْفَارِسِيِّ قَالَ خَطَبَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ
وَسَلَّمَ فِيْ اٰخِرِ يَوْمٍ مِّنْ شَعْبَانَ فَقَالَ : " يَا أَيُّهَا النَّاسُ
قَدْ أَظَلَّكُمْ شَهْرٌ عَظِيْمٌ شَهْرٌ مُّبَارَكٌ شَهْرٌ فِيْهِ
لَيْلَةٌ خَيْرٌ مِّنْ أَلْفِ شَهْرٍ جَعَلَ اللّٰهُ صِيَامَهُ فَرِيْضَةً
وَقِيَامَ لَيْلِهِ تَطَوُّعًا. مَنْ تَقَرَّبَ فِيْهِ بِخَصْلَةٍ مِّنَ الْخَيْرِ
كَانَ كَمَنْ أَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَمَنْ أَدّٰى فَرِيْضَةً فِيْهِ
كَانَ كَمَنْ أَدّٰى سَبْعِيْنَ فَرِيْضَةً فِيْمَا سِوَاهُ وَهُوَ شَهْرُ الصَّبْرِ
وَالصَّبْرُ ثَوَابُهُ الْجَنَّةُ وَشَهْرُ الْمُوَاسَاةِ وَشَهْرٌ يُزَادُ فِيْهِ
رِزْقُ الْمُؤْمِنِ مَنْ فَطَّرَ فِيْهِ صَائِمًا كَانَ لَهُ مَغْفِرَةً
لِذُنُوْبِهِ وَعِتْقُ رَقَبَتِهِ مِنَ النَّارِ وَكَانَ لَهُ مِثْلُ أَجْرِهِ
مِنْ غَيْرِ أَنْ يَّنْتَقِصَ مِنْ أَجْرِهِ شَيْءٌ قُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ لَيْسَ
كُلُّنَا يَجِدُ مَا يُفَطِّرُ بِهِ الصَّائِمَ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ
عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعْطِي اللّٰهُ هٰذَا الثَّوَابَ مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا عَلٰى
مَذْقَةِ لَبَنٍ أَوْ شَرْبَةٍ مِّنْ مَّاءٍ وَمَنْ أَشْبَعَ صَائِمًا
سَقَاهُ اللّٰهُ مِنْ حَوْضِيْ شَرْبَةً لَا يَظْمَأُ حَتّٰى يَدْخُلَ الْجَنَّةَ
وَهُوَ شَهْرٌ أَوَّلُهُ رَحْمَةٌ وَّأَوْسَطُهُ مَغْفِرَةٌ وَّاٰخِرُهُ
عِتْقٌ مِّنَ النَّارِ وَمَنْ خَفَّفَ عَنْ مَّمْلُوْكِهِ فِيْهِ غَفَرَ اللّٰهُ
لَهُ وَأَعْتَقَهُ مِنَ النَّارِ ۔

(رواہ البیہقی ۔ فی شعب الایمان)

ترجمہ ٹائیٹل نمبر ۳ پر ملاحظہ فرمائیں

قرآن اکیڈمی

۱

وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا

(البقرہ ۲۶۹)

ماہنامہ

حکمتِ قرآن

لاہور

جاری کردہ: ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، مرحوم

مدیر اعزازی: ڈاکٹر ابصار احمد، ایم اے، ایم فل، پی ایچ ڈی،

معاون مدیر: حافظ عاکف سعید، ایم اے (فلسفہ)

جلد ۴	مئی ۱۹۸۵ء مطابق شعبان المعظم ۱۴۰۵ھ	شمارہ ۳

سالانہ زرِ تعاون ۳۰/- روپے ——— فی شمارہ ۳/- روپے

مطبع: آفتاب عالم پریس ہسپتال روڈ لاہور

— یکے از مطبوعات —

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶-کے ماڈل ٹاؤن لاہور ۱۴

فون: ۸۵۳۶۱۱

مضمون نگار حضرات کے آراء سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔

فہرس

- حرفِ اوّل ——— ۳
  عاکف سعید
- سالانہ محاضراتِ قرآنی ——— ۵
  رُوداد ــ اور ــ شرکاء کے موقف کا جائزہ
  ڈاکٹر اسرار احمد
- قرآن اکیڈمی کا دوسالہ تعلیمی کورس ——— ۲۹
  سال اوّل کی رُوداد، اور آئندہ سال کے داخلہ کا اعلان
  ڈاکٹر اسرار احمد
- الٓمّٓ (سورۃ الرّعد) ——— ۴۱
  ڈاکٹر اسرار احمد
- ایمان اور اس کے ثمرات و مضمرات ——— ۴۷
  سُورہ تغابن کی روشنی میں (قسط ۵)
  ڈاکٹر اسرار احمد
- جدید تعلیم اور علماء کا موقف ——— ۶۰
  مولانا سعید الرحمٰن علوی
- قندِ مکرّر ——— ۶۵
  'مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت'
- نقد و نظر ——— ۶۷
  'ایک غلط اجتہاد'
  مولانا سیف اللہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیرِ اہتمام سالانہ محاضراتِ قرآنی، بحمداللہ، حسبِ پروگرام ۲۳ مارچ تا ۲۸ مارچ منعقد ہوئے۔ ان محاضرات کا انعقاد نہایت سنجیدہ علمی ماحول میں ہوا اور پورے محاضرات بہ حیثیتِ مجموعی افہام و تفہیم کا رنگ نمایاں رہا اور یہ سلسلہ نہایت خوشگوار ماحول میں بحسن و خوبی ۲۸ مارچ کی شام کو اختتام پذیر ہوا۔ ان محاضرات کی ایک بھرپور رپورٹ خود انجمن کے صدر موسّس کے قلم سے اس شمارے میں شامل ہے اور جیسا کہ قارئین خود ملاحظہ فرمالیں گے، یہ ایک مختلف انداز کی رپورٹ ہے۔ جس میں اگرچہ واقعاتی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا تاہم اس پر اصلاً تجزیاتی (ANALYTICAL) رنگ غالب ہے۔ اس رپورٹ کے ذریعے محاضراتِ قرآنی کا ایک جامع خاکہ نہایت نمایاں طور پر سامنے آتا ہے۔ چنانچہ اس میں نہ صرف یہ کہ ان قارئین کی ذہنی تشنگی کی بھرپور تسکین کا سامان موجود ہے جو کسی سبب سے ان محاضرات میں شریک نہ ہوسکے بلکہ وہ حضرات بھی اس میں اپنی دلچسپی کا وافر سامان موجود پائیں گے جو ان محاضرات میں شریک رہے۔

قرآن اکیڈمی کی دو سالہ تعلیمی اسکیم کے موضوع پر بھی والدِ محترم، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی ایک مفصل تحریر شاملِ اشاعت ہے۔ اس اسکیم کا اجراء پچھلے سال رمضان المبارک کے فوراً بعد ہوا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر جبکہ اس تعلیمی اسکیم کا پہلا سال مکمل ہونے کو ہے اور نئے داخلے متوقع ہیں، یہ تحریر نہ صرف یہ کہ ایک بھرپور نگاہ واپسیں کی حیثیت رکھتی ہے بلکہ آئندہ تعلیمی سال کے خدوخال کو نمایاں طور پر سامنے لانے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔

نومبر ۸۴ء کے حکمت قرآن میں قصاص و دیت کے موضوع پر ہمارے سابق رفیق کار چوہدری محمد رفیق صاحب کا ایک مفصل مضمون شائع ہوا تھا۔ ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک عالم دین مولانا سیف اللہ صاحب نے اس مضمون کا علمی محاکمہ کرتے ہوئے ایک اعتراض وارد کیا تھا۔ اور خواہش ظاہر کی تھی کہ ان کے ارسال کردہ تنقیدی مضمون کو بھی حکمتِ قرآن کے صفحات میں جگہ دی جائے۔ چنانچہ ہم "دیر آید درست آید" کی آڑ لیتے ہوئے مولانا موصوف کے مضمون کو اس شمارے میں شائع کر رہے ہیں۔

عام طور پر ہمارے یہاں

توحید علمی و نظری یعنی توحید فی العقیدہ

پر تو بہت زور دیا جاتا ہے، لیکن

توحیدِ عملی

پر کما حقہٗ توجہ نہیں دیجاتی

ڈاکٹر اسرار احمد

پر اللہ تعالیٰ نے سُورۂ زُمر تا سُورۂ شوریٰ پر تدبُّر کے دوران

توحیدِ عملی کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں

یعنی: اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین کی فرضیت

کو خوب منکشف بھی فرمایا اور بیان کی توفیق بھی مرحمت فرمائی، اور

شیخ جمیل الرحمٰن کی محنت نے ان خطابات کو کتابی صُورت دیدی

سائز ۱۸ × ۲۲/۸ ○ صفحات ۱۹۲ ○ عمدہ سفید کاغذ ○ دیدہ زیب کور

هدیہ: ۱۵ روپے، علاوہ محصُول ڈاک

مکتبہ تنظیم اسلامی: ۳۶ کے ماڈل ٹاؤن ○ لاہور ۱۴

سالانہ محاضراتِ قرآنی

کی رُوداد اور

شرکاء کے موقف کا جائزہ

از قلم:

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام جو سالانہ محاضراتِ قرآنی اس سال ۲۳ تا ۲۸ مارچ ۸۵ء، قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں منعقد ہوئے ـــــ ان کے لئے جن علماء کرام کو بلاواسطہ یعنی انجمن کے دفتر سے براہِ راست، یا بالواسطہ یعنی بعض مقامات کے رفقاء واحباب کی معرفت دعوت نامے ارسال کئے گئے تھے ان کی کل تعداد لگ بھگ ایک صد تھی۔

ان میں سے جن حضرات نے بالفعل شرکت فرمائی ان کی تعداد ۲۱ ہے۔ جن میں ایک تقسیم تو اس اعتبار سے ہے کہ دس حضرات کا تعلق لاہور سے ہے، آٹھ کا بیرونِ لاہور لیکن اندرونِ پاکستان سے اور تین کا ہندوستان سے ـــــ اور ایک دوسری تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ ان میں سے دو تہائی یعنی پندرہ حضرات بلاشک وشبہ ملک گیر شہرت کے حامل اور مختلف مکاتبِ فکر کے علماء و زعماء کی صفِ اوّل سے متعلق ہیں اور ایک تہائی تعداد نسبتاً نوجوان علماء پر مشتمل ہے ـــــ ان حضرات کے اسماءِ گرامی حسبِ ذیل ہیں:

ـــــ لاہور سے: ـــــ

(۱) مولانا محمد مالک کاندھلوی
(۲) مفتی محمد حسین نعیمی
(۳) حافظ عبدالقادر روپڑی
(۴) سید محمد متین ہاشمی
(۵) پروفیسر حافظ احمد یار
(۶) ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی
(۷) حافظ عبدالرحمٰن مدنی
(۸) قاری سعید الرحمٰن علوی
(۹) ڈاکٹر خالد علوی
(۱۰) حافظ نذر احمد

بیرونِ لاہور سے :

(۱) مفتی سیاح الدین کاکاخیل (اسلام آباد) (۲) سید مظفر حسین ندوی (مظفر آباد)
(۳) سید عنایت اللہ شاہ بخاری (گجرات) (۴) مولانا عبدالغفار حسن (فیصل آباد)
(۵) مولانا عبدالوکیل خطیب (کراچی) (۶) مولانا محمد اسحٰق روپڑی (کراچی)
(۷) مولانا الطاف الرحمٰن (بنوں) (۸) مولانا شبیر احمد نورانی (کراچی)

ہندوستان سے :

(۱) مولانا وحید الدین خاں (دہلی) (۲) قاری محمد عبدالعلیم (حیدرآباد)
(۳) میر قطب الدین علی چشتی (حیدرآباد)

راقم الحروف کے پاس الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا جاسکے کہ انہوں نے اپنی شدید مصروفیات اور وقیع مشاغل میں سے وقت نکالا اور راقم کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے شرکت فرمانے کی زحمت گوارا کی۔ بالخصوص وہ حضرات جنہوں نے سفر کی صعوبت برداشت کی، راقم اور اس کے جملہ رفقاء کے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالےٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

اس فہرست میں تین نوجوان علماء کا اضافہ تو اس پہلو سے ہے کہ ان میں سے ایک صاحب یعنی مولانا عبدالرؤوف (خطیب آسٹریلیا مسجد، لاہور) جو باضابطہ مدعو تھے، ایک دن تشریف لائے تو وقت کی کمی کے باعث راقم نے ان سے معذرت کرلی اور اگلے دن کا وعدہ لے لیا لیکن دوسرے روز وہ تشریف نہ لاسکے ـــــ ایک صاحب یعنی کوٹ رادھا کشن کے مولانا عبدالحکیم سیف صاحب، جنہوں نے از خود حصہ لینے کی خواہش کی اور مقالہ پیش کیا۔ اور ایک صاحب یعنی اکبرالدین قاسمی جو اپنے ذاتی جذبے اور شوق کے تحت حیدرآباد دکن سے تشریف لائے لیکن چونکہ آخری وقت پہنچ پائے لہٰذا عملاً حصہ نہ لے سکے ـــــ راقم ان تینوں حضرات کا بھی تہ دل سے ممنون ہے ـــــ اور ایک بزرگ شخصیت یعنی مولانا سعید احمد اکبرآبادی کا اس اعتبار سے کہ اگرچہ وہ شرکت کی شدید خواہش کے باوجود اپنی شدید علالت اور معالجین کی قطعی ممانعت کے باعث تشریف تو نہ لاسکے لیکن ان کا ایک پینتیس منٹ کا ٹیپ شدہ خصوصی پیغام اور انٹرویو پہلے اجلاس میں سنوایا گیا ـــــ گویا سلسلۂ محاضرات کا 'افتتاح' اسی سے ہوا ـــــ اس طرح مولانا موصوف کی بھی 'بالفعل' نہیں تو 'بالقوہ' شرکت ان محاضرات میں ہوگئی۔ اس حساب سے ان محاضرات کے 'شرکاء' کی کل تعداد ۲۵ بنتی ہے۔

عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ ٹھیک یہی تعداد اُن حضرات کی ہے جنہوں نے مصروفیت یا کسی

دوسرے عذر کی بنا پر شرکت سے معذرت کی، یا مزید برآں اجمالی تائید و تصویب سے بھی نوازا، یا بھرپور تائید و تحسین فرمائی یا اجمالی اختلافات کا اظہار فرمایا یا بعض نکات پر تفصیلی اختلافی تحریریں ارسال فرمائیں ـــــــ یا شدید اظہارِ بیزاری و اعلانِ برأت فرمایا! عجیب تر اتفاق یہ ہے کہ ان میں سے بھی بائیس حضرات تو وہ ہیں جنہیں ہماری جانب سے دعوت نامہ ارسال ہوا تھا اور تین وہ ہیں جنہوں نے از خود 'کرم' فرمایا اور اپنے جذبۂ نصح و اخلاص کے تحت ہماری 'رہنمائی' کی خدمت سرانجام دی ـــــــ راقم الحروف ان تمام حضرات کا بھی بلا استثناء تہِ دل سے ممنون ہے اور اپنی اور اپنے جملہ رفقاء کی جانب سے ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہے ـــــــ عمومی دلچسپی کے لئے اِن حضرات کے اسماء گرامی کی فہرست بھی ذیل میں درج کی جا رہی ہے:

(۱) مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی (لکھنؤ) (۲) مولانا محمد منظور نعمانی (لکھنؤ)
(۳) مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی) (۴) مولانا عبدالکریم پاریکھ (ناگپور)
(۵) مولانا سیّد شمس پیرزادہ (بمبئی) (۶) مولانا نورالحق ندوی وزیری (پشاور)
(۷) حضرت مولانا خان محمد (کندیاں شریف) (۸) مولانا گوہر رحمان صاحب (مردان)
(۹) مولانا محی الدین لکھوی (دیپالپور) (۱۰) مولانا محمد اسحٰق صدیقی (کراچی)
(۱۱) مولانا سمیع الحق (اکوڑہ خٹک) (۱۲) مولانا عبدالحق حقانی (اکوڑہ خٹک)
(۱۳) مولانا قاضی شمس الدین (گوجرانوالہ) (۱۴) مولانا محمد طاسین (کراچی)
(۱۵) مولانا بدیع الدین شاہ (پیر جھنڈا، سندھ) (۱۶) مولانا محمد یوسف لدھیانوی (کراچی)
(۱۷) مولانا محمد ازہر (ملتان) (۱۸) مولانا محمد عبداللہ (اسلام آباد)
(۱۹) سیّد اسعد گیلانی (لاہور) (۲۰) مولانا نعیم صدیقی (لاہور)
(۲۱) حافظ احسان الٰہی ظہیر (لاہور) (۲۲) پروفیسر طاہر القادری (لاہور)
(اور از خود 'کرم' فرمانے والے) ـــــ (۲۳) جناب جاوید احمد (لاہور)
(۲۴) جناب عبدالمجیب (کراچی) (۲۵) جناب محمد عبداللہ (لاہور)

راقم الحروف ایک بار پھر ان تمام حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے اور امید رکھتا ہے کہ آئندہ بھی یہ حضرات اسی طرح تعاون فرماتے رہیں گے، بقول غالبؔ ؎

"ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا اور درویش کی صدا کیا ہے!"

اس سال کے 'محاضرات' متعدد اعتبارات سے منفرد شان کے حامل تھے :۔

اولاً ـــــ اس اعتبار سے کہ مسلسل چھ دن روزانہ ساڑھے تین چار گھنٹے ایک ہی موضوع پر اوسطاً روزانہ چار حضرات نے اظہارِ خیال فرمایا لیکن آخر وقت تک نہ مقررین کے جوش و خروش میں کوئی کمی آئی نہ سامعین کے ذوق و شوق اور دلچسپی ہی میں کسی کمی کا احساس ہوا۔

ثانیاً ـــــ حاضرین و سامعین کی تعداد بھی گذشتہ سالوں کے مقابلے میں بہت زیادہ رہی۔ حالانکہ قرآن اکیڈمی شہر سے بہت دور اور ٹریفک کے ذرائع کے اعتبار سے بہت الگ تھلگ جگہ پہ واقع ہے اور رات کے نو دس بجے کے بعد وہاں سے واپسی کے لئے کسی چیز کا دستیاب ہونا بہت دشوار ہے۔ تاہم اس کا ایک ظاہری سبب یہ تھا کہ چونکہ اسی موقع پر اور اسی جگہ 'تنظیم اسلامی پاکستان' کا سالانہ اجتماع بھی ہو رہا تھا اور ساڑھے تین صد کے قریب لوگ تو وہاں مستقل مقیم ہی تھے۔ لہٰذا شہر سے روزانہ دو ڈھائی صد حضرات کی شرکت سے بھی بھرپور جلسے کا سماں بندھ جاتا تھا۔

ثالثاً ـــــ اور اہم ترین یہ کہ ان محاضرات کے 'موضوعِ بحث' کے طور پر قرآن حکیم کے ایک طالب علم اور اللہ کے دینِ متین کے ایک خادم نے، جو دینی و ملّی خدمات کے میدان میں ایسا نووارد بھی نہیں بلکہ لگ بھگ چالیس برس سے سرگرمِ عمل ہے اور تقریباً بیس سال سے تو اپنی انفرادی سوچ اور آزادانہ نقطۂ نظر کے ساتھ بحمد اللہ پوری تندہی کے ساتھ دینی خدمت میں مشغول ہے، اپنے دینی فکر کا 'لُبِّ لُباب'، اپنے مطالعے کا نچوڑ اور بالخصوص اپنے "تصوّرِ فرائضِ دینی کا خلاصہ" متعیّن الفاظ میں مرتّب کر کے پیش کیا تھا۔ اور اس پر 'موافقین' اور 'مخالفین' سب کو آزادانہ اظہارِ خیال کی کھلی دعوت دی تھی۔ راقم نے جب اس کا فیصلہ کیا تھا تو اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ کوئی بہت انوکھا اور نادر کام کرنے چلا ہے لیکن جب محاضرات کے دوران بلا استثنائے واحد جملہ مقررین و مقالہ نگار حضرات، بالخصوص 'ناقدین' و 'مخالفین' نے برملا اعتراف کیا کہ "ایسا کم از کم معلوم تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے!" اور "اس وسعتِ قلب کی کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی!" اور "عام طور پر تو لوگ اختلاف کرنے والوں کو اپنے پلیٹ فارم کے قریب تک بھی پھٹکنے نہیں دیتے!" اور "یہ ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے!" اور "امید ہے کہ اس سے بہت اچھی اور مبارک و مستحسن روایت قائم ہوگی۔ اور مفید نتائج برآمد ہوں گے"۔ وغیرہ وغیرہ ـــــ تو راقم کے قلب کی گہرائیوں سے شکرِ خداوندی کا جذبہ بالکل (امام راغب کی بیان کردہ مثال کے مطابق) "عَینٌ شَکرَیٰ" کی سی کیفیت کے ساتھ ابھرا۔ اور راقم نے اپنے

اس اقدام کی برکات کو جو خالصتہً اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور توفیق ہی کی بنا پر ممکن ہوا تھا چشم باطن ہی نہیں سر کی آنکھوں سے بھی دیکھا ۔ فَلِلّٰہِ الحمد والمنۃ !!!

رابعًا ـــــ یہ کہ محاضرات کے پورے سلسلے کے دوران نہایت خوشگوار فضا قائم رہی اور خالص افہام و تفہیم کا ماحول برقرار رہا ۔ چھ دن میں کوئی ایک چھوٹی سے چھوٹی مثال بھی تلخی یا ناخوشگواری کی پیش نہیں آئی ۔ حالانکہ سامعین کی غالب اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو راقم کے دروس و خطابات اور تحریر و تقریر سے متاثر ہو کر اس کے رفیق و شریک کار اور اعوان و انصار بنے ہیں ـــــ اور دُور ہی دور سے کسی کا متفق یا مدّاح ہونا دوسری بات ہے ، کسی دینی کام میں عملی شرکت اس کے بغیر نہیں ہوتی کہ اس کے داعی و قائد کے ساتھ صرف اتفاقِ رائے اور ہم خیالی ہی نہیں کسی نہ کسی درجہ میں محبت و عقیدت کا تعلق قائم نہ ہو جائے ـــــ ادھر ان محاضرات کے دوران راقم کے دینی فکر پر شدید تنقیدیں ہی نہیں ہوئیں اس کے بارے میں استہزائیہ انداز بھی اختیار کیا گیا لیکن یہ اللہ تعالےٰ کا خصوصی فضل و احسان ہے کہ راقم اور اس کے ساتھیوں نے یہ سب کچھ نہایت خندہ پیشانی اور صبر و تحمل کے ساتھ سنا اور ایک لمحے کے لئے بھی تلخی و ناگواری تو دور کی بات ہے ماحول پر تکدر بھی طاری نہ ہونے دیا بلکہ اس کے برعکس بحمد اللہ و بفضلہ ایک شگفتگی کی سی کیفیت مسلسل طاری رہی ! ـــــ

ـــــ ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُوالْفَضْلِ الْعَظِيْمِ !

یہ ناقابلِ یقین کیفیت ایسے ہی پیدا نہیں ہو گئی بلکہ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو بروقت کچھ فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائی ـــــ جو یہ ہیں :

ایک یہ کہ راقم نے محاضرات کے آغاز سے ہفتہ عشرہ قبل ہی ' بالکل ' اس طرح جیسے نماز یا روزہ سے قبل نیت ' باندھی ' جاتی ہے اپنی اس نیت کو شعوری طور پر پختہ کیا کہ میں ان محاضرات کے دوران علماءِ کرام کے ارشادات کو اپنے فکر کے جملہ صغریٰ کبریٰ اور تمام تانے بانے کو امکانی حد تک ذہن سے نکال کر مقدور بھر کھلے کانوں سے سنوں گا اور کھلے دل و دماغ کے ساتھ ان پر غور کروں گا اور اگر مجھے کہیں کوئی ' روشنی ' ملی اور دل نے گواہی دی کہ میں نے کسی معاملے میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے تو اس کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے اپنی پوری سوچ کو از سر نو استوار کرنے سے دریغ نہ کروں گا ۔ پھر میں نے یہ ' نیت ' صرف ' سرًّا ' ہی نہیں ' جہرًا ' اور ' علانیۃً ' علی رؤس الاشہاد بھی کی چنانچہ اپنے خطابِ جمعہ میں مسجد دارالسلام ' باغ جناح ' لاہور کے بھرے مجمع میں اس کا اعلان کیا ـــــ جدید سائیکالوجی کے ماہرین خواہ اسے " خود تلقینی " (Auto-Suggestion)

سے تعبیر کریں، لیکن میں نے اس طرزِ عمل کو بہت مفید پایا ہے اور میرے نزدیک یہی حکمت نماز کے لئے نیت، باندھنے، یا روزہ کے لئے نیّت کے مسنون الفاظ زبان سے ادا کرنے کی ہے!

——— بہرحال اپنے اسی شعوری فیصلے کے منطقی نتیجے کے طور پر راقم نے بعض ایسے تنظیمی امور سے متعلق فیصلوں کو بھی ملتوی کر دیا جن کا اعلان اسی سالانہ اجتماع کے موقع پر ہونے والا تھا۔ اور اپنے ساتھیوں سے صاف عرض کر دیا کہ ان معاملات پر اب ان محاضرات کے بعد از سرِ نو غور ہوگا!

——— اپنے اسی فیصلے پر باحسن وجوہ عمل کرنے کے لئے راقم نے اپنے لئے طے کر لیا تھا کہ اس کی حیثیت ان محاضرات میں محض 'سامع' کی ہوگی۔ اگر کسی موقع پر ناگزیر ہی ہو گیا تو صرف خالص استفہامی انداز میں سوال کروں گا۔ اپنے اس فیصلے کی اہمیت کا احساس بھی راقم الحروف کو اس وقت ہوا جب مولانا وحید الدین خاں صاحب نے دہلی سے آمد کے فوراً بعد فرمایا کہ اس قسم کے موضوعات پر بحث کھلے مجمعوں میں ہونی درست نہیں ہے اور اس پر راقم نے عرض کیا کہ اس میں میری حیثیت صرف 'سامع' کی ہوگی۔ اگر شدید ضرورت محسوس کی تو بھی میں صرف سوال کروں گا جوابی تقریر ہرگز نہیں کرونگا۔ تو وہ فوراً مطمئن ہو گئے! ——— (عجیب حُسنِ اتفاق یا سُوءِ اتفاق ہے کہ پورے محاضرات کے دوران راقم نے صرف ایک سوال کیا اور وہ مولانا وحید الدین خاں صاحب ہی سے تھا، اور اس پر جب انہوں نے صاف اعتراف کر لیا کہ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے!! اگرچہ اس سے اُنکی تقریر کا تاثر مجروح ہو گیا ——— لیکن میرے دل میں ان کی محبت و عظمت پہلے سے دوچند ہو گئی!!

دوسرے یہ کہ راقم نے محاضرات کے آغاز سے ایک دن قبل رفقائے تنظیم اسلامی کے اجتماع میں اسی کی تلقین اپنے رفقاء کو کی۔ بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کا حکم دیا کہ (۱) جملہ علماء کرام ——— خواہ وہ ہمارے موافق ہوں یا ناقد ہمارے محسن ہیں، ان کی تشریف آوری ایک عظیم تعاون ہے، لہٰذا ان کا ادب پورے طور پر ملحوظ رہے۔ (۲) ان کی تقاریر کو کھلے کانوں ——— اور کھلے دلوں کے ساتھ سنیں اور کھلے ذہن کے ساتھ ان پر غور کریں۔ اگرچہ جذباتی طور پر متأثر ہونا درست نہ ہوگا، بلکہ ہمیں ان کے دلائل کو اپنے دینی فکر کے صُغریٰ کبریٰ کے ساتھ تقابل کر کے پورے شعور و ادراک کے ساتھ رد یا قبول کرنا ہے (لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ) (۳) محاضرات کے دوران نظم پوری طرح برقرار رہے ——— اور کسی ناگواری کیا بے چینی تک کا اظہار نہ ہو، اختلافی باتیں پورے صبر و تحمل سے سنیں اور سوالات بھی صرف بغرض استفہام ہوں۔ ان

میں نہ 'جارحیت' ہو نہ 'جرح' کا انداز !!

راقم اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے اور اس کے رفقاء کو ان فیصلوں پر الفاظ ظاہری اور روح باطنی دونوں کے اعتبار سے بتمام و کمال عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائی ۔ ؎

"ایں سعادت بزورِ بازو نیست ! تا نہ بخشد خدائے بخشندہ !"

بدقسمتی سے اس تصویر کا دوسرا رخ اتنا شاندار نہیں ہے ۔ راقم الحروف کو "خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے !" کے مصداق علماء کرام بالخصوص اکابر علماء سے معذرت کے ساتھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ ان کا ادب و احترام اپنی جگہ' محاضرات میں شرکت کی صورت میں ان کے تعاون و احسان کا بارِ گراں برحق' لیکن ان کی اکثریت نے موضوعِ بحث کا حق ادا نہیں کیا ۔ اور اکثر و بیشتر نے صرف متفق علیہ امور پر وعظ و نصیحت پر اکتفا کی ۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ ان کے عظمت کردار کی مظہر ہے کہ بعض حضرات نے بلا عذر اعتراف کیا اور بعض نے متعین عذرات کی بنا پر وضاحت فرمائی کہ وہ اصل موضوع پر بحث تیاری کا حق ادا نہ کر سکے اور ان شاء اللہ آئندہ کسی موقع پر مزید تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بات کریں گے ـــــ چنانچہ بعض حضرات نے اس قسم کے مباحث و مذاکرات کے لئے ایک مستقل فورم یا پلیٹ فارم کی قیام کی تجویز پیش فرمائی ـــــ راقم کے لئے یہ بات نہایت خوش آئند ہے ۔ اس لئے کہ اس کا ذہن اور مزاج ابتداء ہی سے یہی ہے' اور اگرچہ اپنے کام میں شدید مشغولیت و انہماک کے باعث وہ علماء کرام سے ذاتی سطح پر زیادہ ربط ضبط قائم نہ رکھ سکا لیکن اس نے "قرآن کانفرنسوں' اور 'محاضراتِ قرآنی' کے ذریعے دراصل اسی نوع کے مشترک پلیٹ فارم کے قیام کی سعی کی ہے ۔ پھر تنظیم اسلامی میں 'حلقہ مستشارین' کا قیام بھی اس کے اسی انداز فکر اور افتادِ طبع کی عکاسی کرتا ہے ۔ اور جب اور جہاں ممکن ہوتا ہے وہ علماء کرام کی خدمت میں طلب علمانہ حاضری کو اپنی سعادت سمجھتا ہے ! واللہ علیٰ ما اقول وکیل !! ـــــ بہرحال اس سال کے محاضراتِ قرآنی ان شاء اللہ العزیز اس سلسلے میں ایک اہم سنگ میل ثابت ہوں گے اور خاص اس موضوع پر مزید مجالس مذاکرہ کا انعقاد انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہے گا ۔ وباللہ التوفیق والتیسیر :

آئندہ مزید غور و فکر کے دروازے کو کھلا رکھتے ہوئے' ان محاضرات کی حد تک راقم الحروف کو اپنے

عجزِ بیان، بالخصوص اندازِ تحریر کی خامی سے پیدا شدہ چند غلط فہمیوں پر تنبیہ کے سوا اپنے اساسی موقف کی کسی غلطی یا اپنے فکر کے صغریٰ کبریٰ کی کسی خامی یا اُن سے حاصل شدہ نتائج کے ضمن میں کسی افراط یا تفریط کا سراغ نہیں ملا ـــــــ بلکہ اس کے برعکس راقم کو ان امور کے ضمن میں متعدد علماء کرام کی جانب سے نہایت زوردار تصویب و تائید حاصل ہوئی ہے اور بحمداللہ ان محاضرات کے نتیجے میں راقم اپنے موقف پر پہلے سے زیادہ جازم و عازم ہے ! ـــــــ تاہم جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مزید گفت و شنید اور بحث و تمحیص کا سلسلہ پوری ذہنی و قلبی آمادگی کے ساتھ جاری رہے گا۔

راقم کو اپنے عجزِ بیان ـــــــ اور اظہارِ مافی الضمیر کی کوتاہی کا یوں تو مستقلاً ہی اقرار و اعتراف ہے، تاہم ان محاضرات کی موضوعِ بحث تحریر کا معاملہ یہ ہے کہ یہ بہت روا روی میں لکھی گئی تھی لہٰذا اس میں بعض فاش غلطیاں ایسی ہو گئیں جنھوں نے شدید مغالطوں کو جنم دیا چنانچہ ان میں سے بعض کا راقم نے جمعہ ۲۲ مارچ کو مسجد دارالسلام میں خطابِ جمعہ میں اعتراف و اعلان بھی کر دیا تھا۔ تاہم چونکہ مقررین حضرات تو وہاں موجود نہ تھے۔ لہٰذا مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں کہ اکثر ناقدین نے ان ہی کو اپنے اظہارِ خیال کا موضوع بنایا ـــــــ بہرحال راقم ان کے شکریے کے ساتھ ان امور کے ضمن میں اپنے اصل موقف کو درج ذیل کر رہا ہے۔

(۱) ان میں سب سے پہلی 'غلطی' یہ ہوئی کہ راقم نے علماءِ کرام کے نام اپنے خط کے آخر میں یہ الفاظ استعمال کر دیئے کہ:

> "آخر میں جناب سے مؤدبانہ گذارش ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لئے ضرور وقت نکالیں۔ اس لئے کہ کسی دینی خدمت و تحریک کی بروقت رہنمائی خصوصاً جبکہ اس کا محرک و داعی خود اس کے لئے مستدعی ہو ایک اہم دینی فرض ہے ! ـــــــ بصورتِ دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ پر ایک حجت قائم ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی جناب ہی نے توجہ نہ فرمائی"

اب اسے میں اپنی بدقسمتی کے سوا اور کسی چیز پر محمول نہیں کر سکتا کہ بعض علماء کرام نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ میں گویا اس کا مدعی ہوں کہ میں نے ان پر 'اتمامِ حجت' کر دیا ہے کہ وہ میری تنظیم میں شامل اور میری بیعت میں داخل ہوں۔ "معاذ اللہ" کہ یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے !" اور حاشا و کلا میرے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں بھی ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے !

(۲) دوسری اہم غلطی یہ ہوئی کہ راقم نے ایک مسلمان کے تین اساسی دینی فرائض میں سے اوّلین یعنی

"یہ کہ وہ فوز صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!" کی وضاحت کے ضمن میں سورۂ بقرہ کی آیت ۸۱ کا جو حوالہ دیا اس سے بجا طور پر یہ مغالطہ ہوا کہ شاید میں بھی معتزلہ کی طرح عصاۃ اہل ایمان کے لئے "خلود فی النار" کے امکان کا قائل ہوں۔ میں اس سے بھی اظہارِ برأت کرتا ہوں۔ میرے نزدیک صحیح بات وہی ہے جو احادیثِ صحیحہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے یعنی جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا اگر اس کے گناہوں کا وزن نیکیوں سے بڑھ کر ہوا تو وہ اپنے گناہوں کے بقدر سزا بھگت کر بالآخر دوزخ سے نکال لیا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس مقام پر اس آیۂ مبارکہ کا حوالہ بے محل اور غلط ہے ——— رہا یہ سوال کہ اس آیت کا صحیح مدلول میرے نزدیک کیا ہے تو میرے نزدیک یہ آیت اپنے نفسِ مضمون کے اعتبار سے ان احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مشابہت رکھتی ہے جن میں تنبیہ اور ترہیب کی غرض سے بعض اعمال پر نفیِ ایمان کی وعید سنائی گئی ہے۔ ان آیات مبارکہ اور احادیثِ شریفہ کے ضمن میں نہ یہ روش درست ہے کہ ان کے ظاہری الفاظ سے بالکل قانونی اور منطقی معانی نکالے جائیں جس سے شدید مایوسی پیدا ہو جائے، نہ یہ صحیح ہے کہ ان کی ایسی توجیہیں کی جائیں کہ ان کی تاثیر ہی ختم ہو کر رہ جائے اور بے خوفی اور لاپرواہی جنم لے لے: ——— بلکہ دوسری آیات و احادیث کی روشنی میں ان کی ایسی تعبیر کی جانی چاہیئے جس سے سامع اور قاری میں "بین الخوفِ والرجاء" کی کیفیت قائم رہے۔ واللہ اعلم ——— بہرحال اس مسئلے کا اصل تعلق ایمان اور عمل کے باہمی لزوم یا عدم لزوم اور ایمان میں کمی بیشی کے امکان یا عدم امکان کے ضمن میں اس اختلاف سے ہے جو ہمارے یہاں اسلاف سے چلا آرہا ہے اور جس کے ضمن میں تاحال راقم کی رائے یہ ہے کہ اس دنیا کی حد تک اور قانونی و فقہی سطح پر صحیح بات یہی ہے کہ ایمان جدا ہے اور عمل جدا، اور نفسِ ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی لیکن حقیقت کے اعتبار سے صحیح بات یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ ایمانِ حقیقی یعنی یقینِ قلبی گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی بلکہ ایمان اور عمل صالح لازم و ملزوم ہیں اور یہ لزوم دو طرفہ ہے یعنی ایمان بڑھے گا تو عمل صالح میں بھی لازماً اضافہ ہوگا اور معاصی میں لامحالہ کمی آئے گی اور ایمان گھٹے گا تو عمل صالح میں کمی واقع ہوگی اور معاصی میں اضافہ ہوگا اور اسی طرح عمل صالح بڑھے گا تو اس سے ایمان میں بھی اضافہ ہوگا اور عمل صالح میں کمی آئے گی اور معاصی بڑھیں گے تو اس سے ایمان بھی متاثر ہوگا اور اس میں لازماً کمی آئے گی ———

اور یہ ـــ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے اپنی پناہ میں رکھے ـــ بہرحال اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ امکان کے درجے میں یہ احتمال موجود ہے کہ اعمالِ صالحہ کے مسلسل فقدان اور معاصی پر دوام و اصرار بالخصوص اکلِ حرام پہ جان بوجھ کر استمرار و مداومت کے نتیجے میں ایمان کی پونجی بالکل ختم ہو جائے اور احادیثِ نبویہؐ میں وارد شدہ الفاظ "ولیس وراء ذالکَ من الایمان حبّۃ خردل" ـــ یا "ایۃُ المنافق ثلاثٌ وان صام وصلّٰی وزعم انہٗ مسلمٌ ....." کا مصداق وجود میں آجائے !! ـــ اور ظاہر ہے کہ اگر اسی حالت میں موت واقع ہو جائے تو ایسے شخص کا معاملہ اس کا سا نہیں ہوگا جو ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا ہو خواہ گناہوں کا بہت سا انبار اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ ھٰذا ما عندی حتی الوقت والعلم عند اللہ وارجوان ینبہَنِیَ اللہُ والذین اوتوا العلم ان کنت خاطیًا ـــ !! ـــ بہرحال جو شخص ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا ہو خواہ اس کی مقدار کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو اس کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے اور اس کے ضمن میں میرا موقف وہی ہے جو جملہ اہلِ سنّت کا ہے اور مجھے اللہ تعالےٰ کے فضل و کرم سے پوری امید ہے کہ اسی پر میری موت واقع ہوگی!

(۳) تیسرا سلسلۂ مغالطات پیدا ہوا راقم کی حسبِ ذیل عبارت سے :

"فریضۂ ثالث کے ضمن میں 'بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف' کی صورت لازمی و لابدی ہے۔ چنانچہ اس کا لزوم ثابت ہوتا ہے مسلمؒ کی روایت (عن عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہما) سے جس میں آنحضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کے یہ الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں کہ "من مات ولیس فی عنقہٖ بیعۃ مات میتۃً جاھلیۃً ـــ!"
ـــ واضح رہے کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں : (۱) اگر کم سے کم شرائط و معیارات پر اترنے والا صحیح اسلامی نظامِ حکومت قائم ہے تو اس کے سربراہ سے بیعتِ سمع و طاعت ہوگی ـ اور (۲) اگر ایسا نہیں ہے تو صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لئے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعتِ سمع و طاعت ہوگی ـــ اور تیسری کوئی صورت ممکن نہیں!"

(۱) اس سے بعض حضرات نے تو یہ نتیجہ اخذ فرمالیا کہ راقم بزعمِ خویش اس مقام پہ فائز ہو گیا ہے کہ سب مسلمانوں پر شخصًا اس کی بیعت لازم ہو گئی ہے۔ تو اس سے تو اسی نوع کا اظہارِ برارت کافی

مستشارین کے رُکنِ رکین مولانا سید حامد میاں صاحب کو کہ اگرچہ وہ اپنی شدید مصروفیات کے باعث اس بار محاضرات کے لئے کوئی تحریر تو سپردِ قلم نہ کر سکے لیکن انہوں نے خاص اس غلطی پر تنبیہہ فرمانے کے لئے راقم کو طلب فرمایا اور قدرے برہمی کے انداز میں فرمایا کہ "اس حدیث سے یہ مطلب تو کسی نے بھی نہیں لیا اور ہمارے تو اسلاف میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے نہ کسی سے بیعت سمع و طاعت کی نہ لی!" ــــ تو اگرچہ فوری طور پر میرے ذہن میں ایک خیال کلبلایا کہ "کسی شئے کا عدم ذکر یا عدم ثبوت اس کے وجود کی نفی کو مستلزم نہیں ہے!" ــــ (اس لئے کہ میرے علم میں استاذی المکرم مولانا منتخب الحق قادری کا بیان کردہ یہ واقعہ ہے کہ ایک بار اچانک علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیریؒ کے ذاتی کتب خانے کی ایک خاص الماری کی صفائی کرتے ہوئے جس کی چابی وہ کبھی کسی کو نہیں دیتے تھے اور اس موقع پر کسی خاص مجبوری سے مولانا کے حوالے کی تھی اچانک ان کی نگاہ سے ایک رجسٹر گذرا جس میں ان لوگوں کے نام اور پتے درج تھے جنہوں نے حضرت مولاناؒ سے بیعتِ جہاد کی ہوئی تھی ــــ مولانا منتخب الحق صاحب کا فرمانا ہے کہ اس روز میری سمجھ میں یہ بات بھی آئی کہ کیوں مولانا نے اپنی رہائش قبرستان میں ایک بالکل ویران و سنسان جگہ پر رکھی ہوئی تھی!) لیکن میں نے اس معاملے میں بحث کی طوالت سے بچنے کے لئے عرض کیا کہ "مولانا! اگر اس حدیثِ نبویؐ کو ظاہری اور قانونی معنوں میں نہ لیا جائے لیکن اس کا حوالہ بیعتِ جہاد اور بیعت سمع و طاعت فی المعروف کے لئے تشویق و ترغیب کے طور پر دیا جائے تو ......؟" اس پر مولانا نے فوراً بلا توقف فرمایا "اس میں کوئی حرج نہیں ہے!" ــــ گویا موضوع زیرِ بحث کی حد تک اس حدیثِ مبارکہ کا حاصل بھی وہی ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت ۸۱ کا!!

(iii) بعض حضرات کو یہ غلط فہمی بھی لاحق ہوئی کہ شاید میرے نزدیک اگر کوئی شخص ایک بار مجھ سے بیعت سمع و طاعت فی المعروف میں منسلک ہو جائے تو پھر اگر وہ کسی بھی صورت میں اس بیعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دے گا تو "مَنْ شَذَّ شُذَّ فِی النَّار" کی وعیدِ شدید کا مستحق ہوگا۔ میں اس سے بھی علی رؤس الاشہاد اعلانِ برأت کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ معاملہ اس "الجماعۃ" کا ہے جو اصلاً تو دورِ نبوی میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیرِ امارت قائم تھی اور تبعاً صرف خلافتِ راشدہ تک قائم رہی جب کہ امت میں دینی و مذہبی، سیاسی و ملی، ملکی و علاقائی اور حکومتی و انتظامی ہر اعتبار سے وحدتِ کُلی برقرار

رہی ـــــ اس کے بعد سے آج تک، اور مستقبل میں دور دور تک اس 'الجماعۃ' کا حقیقی اور واقعی اعتبار سے وجود خارج از بحث ہے۔ البتہ نظری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پوری امتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی اسی 'الجماعۃ' کے حکم میں ہے!

اقامتِ دین اور اعلاء کلمۃ الحق کے لئے قائم ہونے والی کسی بھی جماعت میں شمولیت اور اس کے امیر سے سمع وطاعت فی المعروف کی بیعت انسان پر اس وقت لازم ہوتی ہے جب دو شرطیں پوری ہو جائیں: ایک یہ کہ اس کے دینی فکر اور طریق کار سے مجموعی طور پر اتفاق ہو اور دوسرے یہ کہ اس کے خلوص و اخلاص پر دل گواہی دے دے! پھر اس بیعت پر قائم رہنا بھی اسی وقت تک لازم ہوگا جب تک یہ دونوں باتیں برقرار رہیں ـــــ بصورتِ دیگر اگر (۱) انسان کے علم میں ایسے شواہد آئیں جن کی بنا پر اس خلوص و اخلاص پر اعتماد متزلزل ہو جائے یا (۱۱) انسان دیانتہً یہ محسوس کرے کہ داعی نے جو راستہ ابتداءً اختیار کیا تھا اور جس کی اس نے دعوت دی تھی وہ اس سے منحرف ہو گیا ہے یا (۱۱۱) خود انسان کا ذہن بدل جائے اور وہ خود اس طریقِ کار پر مطمئن نہ رہے جس پر تحریک کا آغاز کیا گیا تھا یا (۱۷) اسے کوئی ایسی جماعت نظر آجائے جو اس سے بہتر طریق پر اور اس سے بہتر قائد کی قیادت میں اقامتِ دین کی جدوجہد کر رہی ہو ـــــ تو اس کا بیعت کو فسخ کرنا جائز ہی نہیں واجب ہو جائے گا ـــــ اِلّا یہ کہ باطن میں پیچھے ہٹنے کا اصل سبب تو کمزوری اور بزدلی یا کوئی ذاتی مصلحت و منفعت ہو لیکن ظاہری سہارا انسان متذکرہ بالا چار صورتوں میں سے کسی کا لے لے ـــــ تو اس صورت میں چاہے دنیا میں اس پر کوئی حکم نہ لگایا جا سکے لیکن عند اللہ وہ ضرور قابلِ مؤاخذہ ہوگا! ـــــ البتہ جب تک کسی شخص میں کسی قائد یا امیر سے بیعتِ سمع وطاعت کے ضمن میں وہ دونوں مثبت اساسات برقرار رہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور ان چار منفی کیفیات میں سے کوئی کیفیت پیدا نہ ہو جو فسخ بیعت کے ضمن میں بیان ہو چکی ہیں اس وقت تک اس کا اس جماعت میں شامل رہنا اور بیعت کا وہ حق ادا کرنا لازم ہوگا جو صحیحین میں حضرت عبادہ ابن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بدیں الفاظ بیان ہوا ہے کہ:

بایعنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعۃ فی العسر والیسر والمنشط والمکرہ وعلی اثرۃ علینا وعلی ان لا ننازع الامر اھلہ وعلی ان نقول بالحق حیثما کنا لا نخاف فی اللہ

لومۃ لائم"

صرف اس فرق کے ساتھ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہر بیعتِ سمع وطاعت میں "فی المعروف" کی قید بہتر تو یہ ہے کہ لفظاً ہو ورنہ معناً لازماً مراد ہوگی!

الغرض ـــــــ راقم ان محاضرات کے بعد بھی' ان تصریحات اور ان سے لازم آنے والی حدود و قیود کے ساتھ، فرائض دینی کے جامع تصور کے ضمن میں اپنے موقف پر جازم و عازم ہے' ان محاضرات کے نتیجے میں تو راقم کو اپنے موقف میں کسی اساسی اور بنیادی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اب اللہ ہی سے دعا ہے کہ اگر میرے اس فکر میں کوئی کجی یا غلطی ہے تو اپنے خصوصی فضل و کرم اور کسی خاص ذریعے سے مجھے متنبہ فرمادے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ

آمین یا ربّ العٰلمین!

راقم الحروف کو پورا احساس ہے کہ قارئینِ "حکمت" محاضرات کے جملہ بالفعل و بالقوہ اور حاضرانہ و غائبانہ شرکاء کے افکار و خیالات سے فرداً فرداً واقف ہونا چاہیں گے۔ اس ضمن میں یہ گذارش ہے کہ ہم تک تحریریں تو صرف معدودے چند حضرات کی پہنچی ہیں۔ اکثر و بیشتر حضرات نے تقاریر کیں تھیں مقدم الذکر حضرات سے ہم یہ درخواست کریں گے کہ وہ اپنی تحریروں پر ہماری مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں نظرِ ثانی فرمالیں تو بہتر ہوگا۔ تاکہ وقت اور قلم و قرطاس کا ضیاع کم ہو۔ اور فائدہ زیادہ! ـــــ اور مؤخر الذکر حضرات سے مزید درخواست یہ ہوگی کہ ہماری ان تصریحات کو بھی مدِنظر رکھ کر اپنی تقاریر کے خلاصے خود مرتب فرماویں تاکہ انہیں سلسلہ وار شائع کر دیا جائے ـــــــ سرِدست مؤیدین و موافقین اور مختلفین و ناقدین کا مختصر جائزہ پیشِ خدمت ہے:

راقم کو سب سے زیادہ کھلی اور بھرپور تائید و تصویب ـــــــ بلکہ حد درجہ حوصلہ افزائی تو ملی ہے مولانا سعید احمد اکبرآبادی مدظلہ سے جو بلاشبہ برصغیر پاک و ہند کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں اور اس اعتبار سے تو "آپ اپنی مثال" کے مصداقِ کامل ہیں کہ ایک طرف دارالعلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور عرصۂ دراز سے اس کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں اور مختلف اوقات میں دارالعلوم ڈابھیل اور مدرسہ عالیہ فتح پوری میں مدرّس رہے ہیں تو دوسری جانب سینٹ سٹیفن کالج دہلی کے لیکچرار، مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل اور مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے ڈین آف تھیالوجی رہے ہیں اور ایک طرف عربی زبان اور علوم دینیہ پر عبور رکھتے ہیں تو دوسری طرف انگریزی زبان و فکر پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اور ان سب پر مستزاد ہے

ان کی ۱۹۳۸ء سے تاحال 'ندوۃ المصنفین' دہلی کی رکنیت اور ماہنامہ 'برہان' کی ادارت ——— اور بیسیوں اعلیٰ پایہ کی علمی کتب کی تصنیف ——— اور اب حضرت شیخ الہند اکیڈمی، دیوبند کی سربراہی.

ان کے ٹیپ شدہ خیالات تو لفظ بلفظ اور من وعن ماہنامہ 'میثاق' کی اپریل ہی کی اشاعت میں شائع ہو رہے ہیں، وہاں ملاحظہ فرمالئے جائیں لیکن عند الملاقات جو ایک 'لطیفہ' صادر ہوا وہ تفنن طبع کے لئے حاضر خدمت ہے ——— ایک ملاقات میں (مذکورہ ٹیپ شدہ انٹرویو والی نہیں، اس لئے کہ اس موقع پر تو راقم موجود نہ تھا) راقم اور اس کے دو رفقاء کی موجودگی میں مولانا نے تائید و تحسین اور حوصلہ افزائی کے ضمن میں بہت کچھ فرما کر اور ڈھیر ساری دعائیں دینے کے بعد فرمایا کہ "بس آپ کی ایک بات سے مجھے شدید اختلاف ہے اور اس سے مجھے بہت کوفت اور تکلیف ہوتی ہے!" اس پر راقم سہم کر ہمہ تن گوش ہو گیا تو اس مطلع کا مقطع یہ ارشاد ہوا کہ "وہ یہ کہ آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ میں عالم دین نہیں ہوں........ آپ عالم ہیں، آپ خطیب ہیں، آپ ادیب ہیں ....!" راقم الحروف کو اس وقت ان کی شخصیت میں حضرت شیخ الہندؒ کے مزاج کی جھلک نظر آئی جنہوں نے اپنے بیٹوں اور شاگردوں کی عمر کے ایک نوجوان کو جو مستند عالم دین بھی نہ تھا ——— اور وضع قطع سے بھی کوئی مذہبی شخصیت نظر نہ آتا تھا جس طرح اپنی آنکھوں پر بٹھایا تھا وہ ان کے معتقدین و متوسلین کی ایک عظیم اکثریت کو آج بھی ناپسند ہے! ——— بہرحال اس ضمن میں کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔ راقم مولانا اکبرآبادی کے ان الفاظ کو صرف دلجوئی اور حوصلہ افزائی پر محمول کرتا ہے ——— اور اپنے بارے میں خود اس کا خیال اوّل و آخر یہی ہے کہ وہ قرآن حکیم کے علم و حکمت کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اللہ کے دین متین کا ایک ادنیٰ خادم ہے ——— اور بس!! ——— اور اسے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے پوری امید ہے کہ اس کے سوا کوئی اور 'دعویٰ' یا 'ادّعا' نہ اس کے دل میں آئے گا نہ زبان پر!!

محاضرات کے 'بالفعل' اور 'حاضر' شرکاء میں سے نو حضرات نے راقم کے دینی فکر اور تصوّر فرائض دینی کی واشگاف اور زوردار یا نسبتاً دبے اور دھیمے الفاظ میں تصویب و تائید فرمائی۔ پانچ حضرات نے بنیادی اور واضح طور پر اختلاف کیا اور سات حضرات کچھ بین بین رہے یعنی انہوں نے بعض پہلوؤں کی تصویب و تحسین فرمائی اور بعض کے ضمن میں کچھ احتیاطوں کا مشورہ دیا۔ راقم کا ظن غالب ہے کہ راقم کی ان پہلی تصریحات کے بعد جو اوپر وضاحت کے ساتھ درج ہو چکی ہیں، یہ حضرات بھی مؤیدین ہی کی فہرست میں شامل ہوں گے۔

قسم اوّل میں سرفہرست ہیں مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل، جن کا تعلق اصلاً حلقۂ دیوبند

سے ہے ۔ثانوی طور پر ان کا شمار جماعتِ اسلامی کے ہم خیالوں اور ہمدردوں بلکہ سر پرستوں میں ہوتا ہے، ایک طویل عرصہ تک ریاستِ پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے ہیں اور فی الوقت اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس میں کام کر رہے ہیں۔

—— دوسرے نمبر پر ہیں مولانا سیّد عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری جو مفتی صاحب ہی کی طرح اصلاً حلقۂ دیوبند ہی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن سماعِ موتیٰ اور حیات النبیؐ کے مسئلے میں ایک جداگانہ رائے کے حامل ہونے کی بنا پر جداگانہ تشخص رکھتے ہیں اور "جمعیت اشاعت التوحید والسُّنّۃ" کے امیر اور سربراہ ہیں۔ تیسری اہم شخصیت ہیں مولانا سیّد مظفر حسین ندوی جو ندوہ میں اپنے زمانۂ تعلیم کے دوران مولانا سیّد مسعود عالم ندوی مرحوم اور مولانا سیّد ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ دونوں کے یکساں منظورِ نظر شاگرد تھے۔ ۱۹۴۸ء کے جہاد کشمیر میں عملاً حصّہ لینے والوں بلکہ اس کا آغاز کرنے والوں میں سے تھے —— اور ایک طویل عرصہ تک حکومتِ آزاد کشمیر کے دینی تعلیم و تربیت کے شعبوں میں خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ چوتھی اہم شخصیت ہے ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب کی جو اصلاً تو شرق پور کے نقشبندی خانوادے سے منسلک ہیں، تاہم عرفِ عام میں بریلوی حلقوں سے زیادہ ربط و ضبط رکھتے ہیں اور فی الوقت پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ معارف اسلامیہ میں تدریس کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ پانچویں واضح مؤیّد ہیں مولانا قاری سعید الرحمٰن علوی جو ایک عرصہ تک ہفت روزہ "خُدّام الدّین" کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اور آج کل جامع مسجد، شاہ جمال، لاہور میں خطیب کی ذمّہ داری ادا کر رہے ہیں۔ بقیہ چار حضرات میں سے دو کراچی کے معروف اہلحدیث علماء و خطباء ہیں یعنی مولانا عبدالوکیل خطیب اور مولانا محمد اسحٰق مدنی اور دو ہمارے حیدر آباد دکن سے آئے ہوئے مہمان تھے یعنی مولانا قاری محمد عبدالعلیم اور میر قطب الدین علی چشتی ——!!

اقامتِ دین کی فرضیت، التزامِ جماعت اور بیعتِ ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ، سمع و طاعت فی المعروف کے لزوم کے تصوّرات سے مجموعی اور اساسی اختلاف کا اظہار کرنے والوں میں سرفہرست تھے مولانا عبدالغفار حسن مدظلہٗ اور مولانا وحید الدین خاں (از دہلی) —— ان کے بارے میں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ ماضی میں ان دونوں حضرات کا طویل اور فعال تعلق رہا ہے جماعتِ اسلامی سے۔ چنانچہ مولانا عبدالغفار حسن کا شمار جماعتِ اسلامی پاکستان کی صفِ اوّل کے رہنماؤں میں ہوتا تھا۔ اور مولانا وحید الدین خان جماعتِ اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔

عجیب بات ہے کہ تیسری حد درجہ تیز و تند اور اختلافی ہی نہیں مخالفانہ تقریر تھی ڈاکٹر خالد علوی صاحب کی جو پنجاب یونیورسٹی میں جمعیت طلبہ کے سرپرست شمار ہوتے ہیں۔ کچھ اسی انداز کی لیکن غیر واضح تقریر تھی حافظ نذر احمد صاحب کی ——— البتہ اسی فکر کی حامل لیکن حد درجہ دھیمی اور مؤثر تقریر تھی مولانا محمد مالک کاندھلوی مدظلہ کی۔ اگرچہ اس میں دلیل و استدلال سے زیادہ تلقین و نصیحت اور جذباتی اپیل کا رنگ تھا ——— واللہ اعلم!!

تیسری فہرست میں نمایاں ترین نام ہیں مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی اور مولانا سید محمد متین ہاشمی کے، پھر نمبر آتا ہے، پروفیسر احمد یار، مولانا الطاف الرحمٰن بنوی، حافظ عبدالرحمن مدنی، مولانا عبدالحکیم سیف اور مولانا شبیر احمد نورانی کا۔ ان حضرات کے بارے میں راقم پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ ان شاء اللہ راقم کی پیش نظر تحریر میں وارد تصریحات کے بعد ظن غالب یہی ہے کہ انہیں کوئی اختلاف نہیں رہے گا۔

جن بچیس حضرات نے 'محاضرات' کے لئے تفصیلی تحریریں ارسال فرمائیں یا محض خطوط تحریر فرمائے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:-

۱۔ مولانا محی الدین لکھوی نے بھرپور تائید کی اور کلی اتفاق کا اظہار فرمایا۔ مولانا پنجاب کے ایک نہایت مشہور اہل حدیث خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے دادا حافظ محمد لکھویؒ نے پنجاب میں ترویج توحید اور ردّ بدعات کے ضمن میں نہایت مجاہدانہ کردار ادا فرمایا تھا۔ اردو پنجابی میں منظوم تفسیر قرآن لکھی تھی۔ ان کے والد مولانا محمد علی لکھوی سے راقم کی ملاقات مدینہ منورہ میں ۱۹۶۰ء میں مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ کے مکان پر ہوئی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا معین الدین لکھوی اس وقت جمعیت اہلحدیث کے امیر اور پاکستان کی موجودہ نیشنل اسمبلی کے رکن ہیں ——— مولانا خود کبھی جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے لیکن جلد ہی بددل ہو کر علیحدہ ہو گئے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں جو پہلا الیکشن پنجاب کی صوبائی اسمبلی کا ہوا تھا مولانا اس کے لئے اپنے ذاتی اثر و رسوخ کی بنیاد پر منتخب ہوئے تھے لیکن بعد میں جماعت اسلامی نے انہیں ADOPT کر لیا تھا۔ چنانچہ کئی سال تک وہ پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں جماعت اسلامی کے 'اکلوتے' نمائندے کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ مولانا ان معدودے چند لوگوں میں سے ہیں جن میں اہلحدیثیت کی سختی اور درشتی کے ساتھ ساتھ تصوف کی مٹھاس اور چاشنی بھی موجود ہوتی ہے ——— (اس کی ایک نادر

روزگار مثال امرتسر اور لاہور کا خانوادۂ غزنویہ ہے) مولانا اپنے بعض تفردات، کے باعث کچھ عرصہ سے الگ تھلگ زندگی گزار رہے ہیں لیکن اب امید ہے کہ یہ کیفیت ختم ہو جائے گی۔ اَللّٰھُمَّ اٰمِیْن !! ——— مولانا موصوف کا خط اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

۲۔ مولانا گوہر رحمان صاحب رکن جماعت اسلامی، شیخ الحدیث دار العلوم تفہیم القرآن مردان اور رکن قومی اسمبلی نے بھی نہایت حوصلہ افزا اور تحسین آمیز خط تحریر فرمایا۔ ان کا خط بھی شاملِ اشاعت کیا جا رہا ہے۔

۳۔ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی ——— جو اس وقت بلاشبہ پورے عالم اسلام کی چوٹی کی دینی شخصیتوں میں سے ہیں ——— اگرچہ محاضرات کے نفس موضوع پر تو نہ کچھ تائیداً فرمایا نہ تنقیداً۔ البتہ راقم الحروف کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے لئے جو الفاظ تحریر فرمائے وہ خود ان کی عظمت کے تو شاہد عادل ہیں ہی راقم کے لئے تا زیست سرمایۂ افتخار رہیں گے۔ ان کا خط بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

۴۔ پانچ حضرات نے مصروفیت کی بنا پر شرکت سے معذرت کرتے ہوئے راقم اور اس کی مساعی کے لئے نیک خیالات و جذبات کا اظہار فرمایا۔ اور دعائے خیر سے نوازا۔ راقم کو ایک گونہ فخر ہے اس پر کہ اس فہرست میں حضرت مولانا خان محمد صاحب، سجادہ نشین، خانقاہ سراجیہ، کندیاں شریف، مولانا نور الحق صاحب ندوی وزیری (پشاور) مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی)، مولانا محمد اسحاق صدیقی (کراچی) اور مولانا سمیع الحق (اکوڑہ خٹک) ایسے حضرات کے اسماء گرامی شامل ہیں۔

۵۔ تین حضرات نے شرکت کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا لیکن بعد میں کسی سبب سے تشریف نہ لا سکے، یہ ہیں مولانا عبدالقیوم حقانی (اکوڑہ خٹک)، مولانا عبدالکریم پاریکھ (ناگپور، انڈیا) اور قاضی شمس الدین صاحب گوجرانوالہ

۶۔ تین حضرات کی جانب سے محض معذرت موصول ہوئی بلا کسی تائید یا تنقید کے یعنی شاہ بدیع الدین صاحب پیر آف جھنڈا (سندھ)، جناب شمس پیرزادہ (بمبئی) اور حافظ احسان الٰہی ظہیر (لاہور)

۷۔ دو حضرات نے مختصر معذرت اور اجمالی اظہارِ اختلاف پر مشتمل خطوط تحریر فرمائے: ایک مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ مدیر الفرقان، (لکھنؤ) اور دوسرے سید اسعد گیلانی ایک از مرکزی قائدین جماعتِ اسلامی۔

۸ پانچ حضرات نے تفصیلی اختلافی نوٹ ارسال فرمائے ۔ یہ ہیں (۱) مولانا محمد طاسین صاحب، مدیر مجلس علمی کراچی (۱۱) مولانا محمد ازہر، مدیر ماہنامہ 'الخیر' ملتان (۱۱۱) پروفیسر طاہر القادری لاہور (۱۷) جناب جاوید احمد، لاہور ـــــ اور (۷) جناب عبدالمجیب، کراچی ـــــ ان میں سے مؤخر الذکر دو حضرات میں متعدد امور مشترک ہیں: ایک یہ کہ دونوں نے از خود کرم فرمائی کی ہے ۔ وہ ہمارے مدعوئین میں شامل نہ تھے ۔ دوسرے یہ کہ دونوں جماعتِ اسلامی کے 'سابقین' کے زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ دونوں کا موقف وہی ہے جو مولانا عبدالغفار حسن اور مولانا وحید الدین خان کا ہے !

۹ تین حضرات نے راقم اور اس کی مساعی سے شدید اظہارِ بیزاری اور اعلانِ براءت فرماتے ہوئے شرکت سے 'انکار' فرمایا ۔ یہ ہیں (۱) جماعت اسلامی کے حلقے کے مشہور ادیب اور دانش ور جناب نعیم صدیقی (۱۱) ماہنامہ 'بینات' کراچی کے مدیر مولانا محمد یوسف لدھیانوی اور (۱۱۱) مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کے خطیب مولانا محمد عبداللہ صاحب ۔

۱۰ از خود 'کرم' فرمانے والوں میں ایک اور صاحب محمد عبداللہ، لاہور، ہیں جنھوں نے ایک تحریر عنائت فرمائی جو نصف تائید و تحسین اور نصف تنقید و اختلاف پر مشتمل ہے ۔

راقم ان تمام حضرات کا تہہِ دل سے شکریہ پہلے بھی ادا کر چکا ہے ۔ آخر میں دوبارہ ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ انہیں اس تعاون کا بھرپور صلہ عطا فرمائے ۔

یہ فہرست نامکمل رہ جائے گی اور حق تلفی بھی ہوگی اگر راقم ڈاکٹر غلام محمد مدظلہ، خلیفہ، مجاز مولانا سید سلیمان ندوی کا شکریہ ادا نہ کرے کہ وہ اپنی شدید مجبوری کے باعث محاضرات میں شرکت سے معذرت پیش فرمانے کے لئے خود چل کر قرآن اکیڈمی تشریف لائے (اس لئے کہ چند روز قبل پنجاب یونیورسٹی کے کسی امتحان کے ضمن میں ان کی لاہور تشریف آوری ہوئی تھی لیکن بعض اسباب سے فوری واپسی لازمی تھی!) دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اخلاق عالیہ و کریمانہ کا کوئی ادنیٰ عکس راقم کو بھی عطا فرمادے ۔

'محاضرات' کی بات لمبی ہوگئی ۔ معذرت خواہ ہوں ـــــ ؎

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم !!

★

۴۔ مکتوب گرامی مولانا محی الدین لکھوی ؒ

بسم اللہِ الرحمٰن الرحیم

من محی الدین اللکھوی الی الاخ المحترم دکتور اسرار احمد ، لاھور

السلام علیکم ورحمۃ اللہ ، اما بعد :۔۔۔ فرمان نبوی ہے "ترکت فیکم امرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما ، کتاب اللہ وسنتی"

معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کے بارے میں آپ نے حقِ تلاوت ادا کیا ہے لیکن سنتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپ نے استغنا رکھا ہے ۔ اور بزرگانِ دین سے زیادہ متاثر رہے ہیں۔ ورنہ اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت ہو جانے کے بعد آپ کو اس قدر تکلف کی ضرورت نہ تھی ۔ اگرچہ آپ کی کاوش قابلِ داد ہے اور آپ کا تصور فرائض دینی "مستحسن ہے ۔ بات صرف یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے لئے یہ بھی ایک فریضہ ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا

اور اس آیہ مبارکہ پر عمل کی صرف ایک صورت ہے ۔ وہ یہ کہ

اِنّی امرکم بخمسٍ ، بالجماعۃ والسمع والطاعۃ والھجرۃ والجھاد

اس وقت جو انارکی اور انتشار پھیل چکا ہے ۔ اس کی وجہ سے ہم موجودہ دور کو شر القرون کہیں تو غلط نہیں اور میرا اس حدیث شریف پر پورا یقین ہے کہ

"من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ"

اس وعید سے بچنے کے لئے سید مودودی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت کی خواہش کی تو انہوں نے خاموشی میں جواب دیا [1] ۔ بعد ازاں چند احباب مسمّٰی باہلحدیث سے مل کر کوشش کی اور صرف اتنی کامیابی ہوئی کہ چند احباب نے جن میں معروف علماء اہلحدیث بھی شامل تھے ۔ میری بیعت کی ۔ لیکن جلدی ہی وہ بیعت ھباءً منثورا ہو گئی اور وہی علماء جو بیعت کے محرک تھے وہ مخرب بن گئے اِنا للہ ...... الخ اس وقت سے میں گوشہ نشین اور علماء سے بیزار ہوں ۔ فاعتزل تلک الفرق کلھا ۔ البتہ عوام الناس سے بحکم "الدین النصیحۃ" بیعت لیتا ہوں اور فَاَعْرِضْ عَنْھُمْ وَانْتَظِرْ اِنَّھُمْ مُّنْتَظِرُوْنَ پر عمل پیرا

---

[1] اس معاملے کی توضیح کے ضمن میں مولانا مودودی مرحوم کا ایک خط اسی شمارے کے صفحہ ۶۵ پر ملاحظہ فرمائیں ۔

ہوں۔ آپ "تنظیم اسلامی" کے نام پر بیعت لیتے رہیں۔ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ کی رو سے یہ صحیح ہے۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہے آپ عالمی سطح پر یہ تحریک چلائیں اور عوام و خواص کو دعوت دیں۔ تاکہ دینی جماعتیں مل کر عالمی سطح پر یہ ایک امیر کا انتخاب کریں اور پورے عالم اسلام میں اتحاد پیدا ہو جائے۔ یا کم از کم عالمی سطح پر ایک متحد اسلامی جمعیت معرضِ وجود میں آجائے۔

بہر حال میں نظام امارت میں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ کو حضور علیہ الصّلوٰۃ والسّلام کا مژدہ سناتا ہوں کہ "من تمسّك بسنّتي عند فساد امتي فله اجر مائة شهيد"۔

والسّلام

محی الدین!

الہ آباد المعروف قلعہ تارے والا، ڈاکخانہ خاص،

براستہ دیپالپور۔ ضلع اوکاڑہ 31-3-85

(نوٹ) میں بوجوہ "محاضرات" میں حاضری نہیں دے سکا۔ لیکن احیاء نظام امارت میں آپ کے ساتھ ہوں۔ جب بھی ممکن ہوا ملاقات کے لئے حاضر ہوں گا۔ انشاء اللہ!

عَنِ الحَارِثِ الاشعرِی، قَالَ، قَالَ رسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ:

"اٰمُرُكُمْ بِخَمْسٍ

بِالجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالهِجْرَةِ وَالجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللهِ"

(مشکوٰۃ المصابیح بحوالہ مسند احمد و جامع ترمذی)

حضرت مولینا مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ

اپنی تالیف **وحدتِ اُمّت** میں اگر

○ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اور مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ

کے دو ایمان افروز اور سبق آموز واقعات کے سوا اور کچھ نہ لکھتے
تب بھی یہ کتاب موتیوں میں تُلنے کی مستحق ہوتی

وقت کے اہم ترین موضوع پر اِس بہترین اور مفید ترین کتاب کو

اب مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور نے شایانِ شان طور پر شائع کیا ہے۔

بڑے سائز کے ۵۲ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور

ھدیہ : ۴ روپے ○ علاوہ محصول ڈاک

ڈاکٹر اسرار احمد

نے اپنی دوسری دینی اور علمی خدمات کیساتھ ساتھ شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں

ایک اصلاحی تحریک

بھی برپا کی اور خطبۂ نکاح کو صرف ایک رسم

کی بجائے واقعی تذکیر و نصیحت اور معاشرتی زندگی سے متعلق اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا ذریعہ بنایا
اس موضوع پر ڈاکٹر صاحب کی ایک اہم تحریر اور ایک خطبۂ نکاح کو دیدہ زیب کتاب کی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔
بڑے سائز کے ۴۸ صفحات ○ عمدہ دبیز کاغذ ○ دیدہ زیب کور ؛

ہدیہ : ۴ روپے ——— محصول ڈاک علاوہ

ان دونوں کی زیادہ سے زیادہ اشاعت اہم قومی، ملی اور دینی فریضہ ہے

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور کے زیرِ اہتمام

قرآن اکیڈمی کے ۲ دو سالہ تدریسی کورس

کے سالِ اوّل کی رُوداد

اور

آئندہ سال کے داخلہ کا اعلان

از قلم ——— ڈاکٹر اسرار احمد ——— صدر انجمن

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور ۱۹۷۲ء میں قائم ہوئی تھی۔

اس کے پیشِ نظر جہاں (۱) "عربی زبان کی تعلیم و ترویج" (۲) "قرآن مجید کے مطالعے کی عام ترغیب و تشویق" اور (۳) "علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت" ایسے 'عمومی **مقاصد**' تھے وہاں (۴) "ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت جو تعلیم و تعلّمِ قرآن کو مقصدِ زندگی بنائیں" اور (۵) "ایک ایسی '**قرآن اکیڈمی**' کا قیام جو قرآنِ حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے" ——— ایسے '**معیّن منصوبے**' بھی تھے۔

قرآن اکیڈمی کا سنگِ بنیاد ۱۹۷۶ء میں رکھا گیا۔

پانچ سال کے عرصے میں تعمیرات کی معتدبہ حد تک تکمیل اور راقم الحروف اور بعض رفقائے کار کی رہائش اور انجمن کے دفاتر کی منتقلی کے ابتدائی اقدامات کے بعد ۱۹۸۱ء میں متذکرہ بالا '**معیّن ہدف**' کی جانب پیشقدمی کا آغاز ہوا۔

چنانچہ ۱۹۸۲ء میں "قرآن اکیڈمی فیلوشپ اسکیم" کا اجراء ہوا۔ جس میں ۷ اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان تعلیم و تعلّم قرآن کے لئے پوری زندگی وقف کرنیکے عزم کے ساتھ شریک ہوئے جن کے نام اور کوالیفکیشن درج ذیل ہیں۔

(۱) ڈاکٹر عارف رشید۔ ایم بی بی ایس (۲) ڈاکٹر عبدالسمیع۔ بی ڈی ایس
(۳) حافظ عاکف سعید۔ ایم اے (فلسفہ) (۴) حافظ محمد رفیق ایم اے (اسلامیات)
(۵) میاں ریاض الحق ایم ایس سی (زوآلوجی) (۶) محمد حنیف ورک ایم ایس سی (کیمسٹری)
اور (۷) حافظ خالد محمود خضر ایم ایس سی (جیالوجی)

راقم الحروف کے لئے یہ امر نہایت موجب اطمینان و امتنان ہے کہ قرآنِ حکیم کی ہدایت "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا" اور دعوت و اصلاح کے عمل کے اصلُ الاصول یعنی "الاقدمُ فالاقدم!" کے عین مطابق اور ایک انگریزی کہاوت "CHARITY BEGINS AT HOME" کے مصداق راقم کے دو فرزند بھی ان سات خوش قسمت نوجوانوں میں شامل ہیں۔

ان نوجوانوں کی دو سالہ تدریس کی تکمیل کے بعد محسوس ہوا کہ جذبہ اور خلوص کے باوصف تخلیقی و تحقیقی کام کی صلاحیت و اہلیت سب لوگوں میں نہیں ہوتی ـــــ چنانچہ اُن میں سے دو نوجوانوں کو تو اُن کی خواہش پر آزاد کر دیا گیا کہ وہ اپنے اپنے CAREERS کو جاری رکھتے ہوئے آزادانہ دین کی خدمت اور دعوت و تبلیغ میں اُس صلاحیت و استعداد کو بروئے کار لائیں جو انہیں دو سالہ تدریس سے حاصل ہوئی ہے۔ باقی پانچ نوجوان بحمداللہ مزید حصولِ علم کے سلسلے کو جاری رکھتے ہوئے انجمن کے تحت دعوتی و تبلیغی، تدریسی و تعلیمی، اور تنظیمی و انتظامی شعبوں میں خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔

گذشتہ سال فیصلہ کیا گیا کہ پوری زندگی کو وقف کرنے کا عہد (COMMITMENT) لئے بغیر ذرا زیادہ تعداد میں نوجوانوں کو ایک دو سالہ تدریسی کورس میں شرکت کی دعوت دی جائے اور ضرورت ہو تو انہیں اُن کے تعلیمی معیار کی مناسبت سے ماہانہ وظیفہ بھی دیا جائے۔ پھر ان میں سے

جو لوگ تخلیقی و تحقیقی کام کی صلاحیت و استعداد کے حامل نظر آئیں انہیں مستقل فیلوشپ سکیم میں شامل کر لیا جائے۔

اس کے لئے اصلاً تو اُن ہی لوگوں کو ترغیب دلائی گئی جو ایک عرصے سے راقم الحروف کے ساتھ وابستہ ہیں اور انجمن خدام القرآن یا تنظیم اسلامی میں سرگرم عمل ہیں لیکن ایک دعوتِ عمومی کے لئے اس سکیم کی تشہیر اخبارات کے ذریعے بھی کی گئی ——— جس کے نتیجے میں اخبارات کے صفحات میں بعض حاسدین اور ناقدین کی جانب سے چہ میگوئی (CONTROVERSY) بھی شروع کی گئی جس کا بروقت جواب دے دیا گیا۔

بحمد اللہ اس دو سالہ تدریسی کورس کا پہلا تعلیمی سال اس شعبان المعظم میں مکمل ہو رہا ہے۔ لہٰذا اس کا ایک جائزہ پیش خدمت ہے۔

(۱)۔ اس کورس کا آغاز چالیس[۴۰] شرکاء سے ہوا۔ لیکن دورانِ سال مختلف اسباب کی بنا پر نو[۹] شرکاء ہمت ہار گئے ——— پہلے تعلیمی سال کی تکمیل کرنے والے شرکاء کی تعداد اکتیس[۳۱] ہے

(۲) ان میں ایک تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ چالیس[۴۰] سال سے زائد عمر کے شرکاء چھ[۶] ہیں، تیس اور چالیس سال کے مابین دس[۱۰] اور تیس[۳۰] سال سے کم عمر کے پندرہ[۱۵]۔

(۳) ایک دوسری تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ ان میں سے اُنیس[۱۹] خود کفیل اور غیر موظف تھے۔ جبکہ صرف بارہ[۱۲] شرکاء کو مختلف مقدار میں ماہانہ وظیفہ دیا گیا۔

(۴) ان کی تعلیمی قابلیت کا چارٹ حسبِ ذیل ہے:

ایم بی بی ایس	۲	بی ڈی ایس	۱
بی وی ایس سی	۱	چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ	۱
بی ایس سی انجینئرنگ (مکینکل)	۲	بی ایس سی، اے ایم آئی ای (سول)	۱
ایم ایس سی	۲	ایم اے	۳
بی ایس سی	۱	بی اے	۸

ایف اے ۴ مختلف ڈپلوما ہولڈرز ۵

دو سالہ تدریسی کورس کے سالِ اوّل کی تکمیل کرنے والے شرکاء میں سے بعض کا معاملہ واقعۃً قابلِ ذکر، قابلِ رشک اور قابلِ تقلید ہے لہٰذا اُن کا ذکر کیا جا رہا ہے :

(۱) ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ کی عمر ۵۰ برس ہے - اور وہ وسن پورہ اور شاد باغ کے علاقے کے مصروف ترین میڈیکل پریکٹشنر ہیں لیکن انہوں نے اس کورس کے دوران صرف شام کا مطب کرنے اور صبح کا پورا وقت خالص طالبعلمانہ انداز میں حصولِ علم میں مشغول رہنے کی جو مثال قائم کی ہے وہ یقیناً قابلِ رشک ہے -

(۲) بالکل یہی معاملہ میرے برادرِ خورد وقار احمد سلمہٗ کا ہے کہ انہوں نے بھی ۴۴ سال کی عمر میں اور ایک مصروف کاروباری زندگی گذارنے کے باوصف (وہ کئی تعمیراتی ٹھیکے لینے والی اور تعمیراتی سامان بنانے والی کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں) بالکل طالبعلمانہ انداز میں عربی زبان کے ابتدائی قواعد یاد کئے — اور ثقیل تعلیم کو خندہ پیشانی سے پوری پابندیٔ وقت کے ساتھ نباہا اور امتحانات میں اکثر اوّل و دوم پوزیشن حاصل کرتے رہے -

(۳) ایک اعتبار سے ان دونوں سے بھی بڑھ کر مثال قائم کی ہے میاں محمد رشید صاحب نے کہ ساٹھ برس کی عمر میں پوری پابندی کے ساتھ تحصیلِ علم میں لگے رہے اور بہت سوں کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال بن گئے -

(۴) ایک اور اہم مثال میاں محمد نعیم صاحب کی ہے — (عمر ۳۹ سال) جو جیالوجیکل سروے آف پاکستان میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہیں اور کوئٹہ میں تعینات ہیں - انہوں نے بلا تنخواہ رخصت حاصل کی - اہل و عیال سمیت شدّتِ حال کیا اور خالص طالبعلمانہ انداز میں علم حاصل کیا -

(۵) اسی سے ملتا جلتا معاملہ میرے دامادِ کلاں محمود عالم میاں کا ہے جو ایم ایس سی کیمسٹری ہیں اور پی سی ایس آئی آر میں کام کرتے ہیں - انہوں نے

بھی رخصت حاصل کی اور اپنی اہلیہ (میری بڑی بچی) سمیت اس کورس میں شرکت کی - الحمدللہ کہ دونوں کا ریکارڈ بہت اچھا رہا بلکہ میری بچی نے بفضلہٖ تعالیٰ تین بچوں کی ماں ہونے کے باوجود حیرت انگیز ترقی کی اور بہت سے امتحانات میں اوّل پوزیشن حاصل کی -

(۶) ایسی ہی ایک قابل تقلید مثال رفیق مکرم چوہدری رحمت اللہ بٹر صاحب کی ہے وہ اے جی آفس میں سپرنٹنڈنٹ ہیں لیکن انہوں نے بھی بلا تنخواہ رخصت حاصل کی اور اپنی بچی سمیت اس کورس میں شرکت کی - ان دونوں باپ بیٹی نے بھی بحمد اللہ نمایاں استعداد حاصل کی -

(۷) میرے دوسرے داماد ڈاکٹر عبدالخالق، بی ڈی ایس ڈینٹل سرجن اور نوجوان رفیق ڈاکٹر وقار احمد بی ایس سی، ایم بی بی ایس نے بھی اپنے مطب صرف شام کے اوقات میں کرلئے اور اس کورس میں باضابطہ شرکت کی -

(۸) ایک اور بہت شاندار مثال اشفاق احمد صاحب کی ہے کہ وہ تازہ تازہ چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ بنے ہیں، اور حال ہی میں ایک معقول ملازمت کا آغاز ہوا تھا - اُن کے والدین کا کچھ عرصہ سے میرے یہاں ایک خاص کام کے سلسلے میں آنا جانا تھا ان ہی دنوں اس کورس کے آغاز کا اہتمام ہو رہا تھا - میں نے ایک بار جبکہ وہ اپنے والد محترم کے ساتھ میرے پاس آئے سرسری طور پر کہہ دیا کہ کیوں نہ آپ بھی اس کورس میں شرکت کرلیں - اُس اللہ کے بندے نے فوراً اپنی فرم سے بات کرکے اپنے کام کے لئے شام کے اوقات طے کرالئے اور اگرچہ اُن کی تعلیم تمام کی تمام انگریزی سکولوں میں ہوئی تھی اور عربی کجا اردو تک سے بہت کم شناسائی تھی تاہم انہوں نے نہایت شدید محنت کرکے اس کلاس کے ساتھ قدم ملا کر دکھا دیئے ! اللہ مزید ہمت عطا فرمائے اور دین کے لئے ہمہ تن قبول فرمالے !

(۹) اسی طرح جاوید اسلم صاحب نے جو بی ایس سی مکینکل انجنیئر ہیں اور ایک کارخانے میں کام کرتے ہیں اپنی ڈیوٹی مستقلاً شام کی شفٹ میں لگوائی ـــــ اور اس کورس میں شرکت کرلی -

(۱۰) کراچی کے محمد یامین صاحب کی مثال بھی قابل رشک ہے - وہ ایم اے اسلامیات کے علاوہ الٹرانکس میں ڈپلوما رکھتے ہیں اور پاکستان کی فضائی فوج میں ملازم ہیں - انہوں نے بھی وہاں سے بلا تنخواہ رخصت حاصل کی، بمع اہل وعیال لاہور آئے اور کورس میں شرکت کی!

(۱۱) ایسی ہی مثال ایک پٹھان نوجوان محمد سلیمان کی ہے، جو مردان کے رہنے والے ہیں اور مرکزی حکومت کے کسی محکمے میں سٹینو ٹائپسٹ ہیں، انہوں نے بھی بلا تنخواہ رخصت حاصل کی اور کورس میں شریک ہو گئے!

(۱۲) صوبہ سرحد کے ایک اور نوجوان اختر منیر نے ایم اے اسلامیات کے بعد کراچی میں ایل ایل بی میں داخلہ لے لیا تھا اور پڑھائی شروع کر دی تھی کہ اچانک اخباری اعلان نظر سے گذرا — اور وہ ایل ایل بی کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کر کے اس کورس میں آ شریک ہوئے -

(۱۳) اس کورس کے بقیہ شرکاء میں سے بھی ہر ایک کا معاملہ کسی نہ کسی اعتبار سے قابل ذکر ہے لیکن بغرض اختصار بقیہ حضرات کے صرف نام اور تعلیمی کوائف درج کئے جا رہے ہیں :-

(i) حافظ خالد محمود	ایم اے (اسلامیات)	میانوالی
(ii) اسد الرحمٰن فاروقی	بی ایس سی انجینئرنگ (مکینیکل)	کراچی
(iii) محمد اسلم قاضی	بی ڈی ایس سی	لاہور
(iv) عبدالرزاق	بی اے	〃
(v) جاوید رفیق	〃	〃
(vi) کلیم الرحمٰن	〃	〃
(vii) محمد اشرف	〃	〃
(viii) مختار احمد خان	〃	〃
(ix) غلام سلطان	〃	آزاد کشمیر
(x) محمد غوری صدیقی	ڈپلوما ان سول انجینئرنگ	لاہور
(xi) شکیل احمد	ایف اے	〃

(xii) نعیم اختر	ایف اے	لاہور
(xiii) محمد افتخار تاج	〃	〃
(xiv) محمد ارشد چیمہ	〃	〃
(xv) شعیب الرحیم انصاری	〃	کراچی
(xvi) میاں ساجد حمید	ڈپلوما ان الیکٹرانکس	لاہور
(xvii) محمد اشرف بیگ	ڈپلوما ان کامرس	〃

(۱۴) چونکہ رفاقت سکیم کے ضمن میں آیتِ قرآنی "قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِيْكُمْ" کا ذکر ہوا تھا، لہٰذا یہاں مناسب ہے کہ تحدیثاً للنعمہ یہ ذکر بھی ہو جائے کہ اس دو سالہ کورس کے ضمن میں اللہ تعالےٰ نے اس عاجز کو "وَ اَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ" کی ایک حقیر سی مثال پیش کرنے کی توفیق عطا فرمائی - اس ضمن میں بھائی، بیٹی اور دو دامادوں کا ذکر اوپر آ چکا ہے - اس لسٹ کی تکمیل ہوتی ہے میرے ایک اور داماد اور حقیقی بھتیجے عزیزم حمید احمد سلمہٗ کے ذکر پر جو بی ایس سی ہیں اور متعدد تعمیراتی لمیٹڈ کمپنیوں کے ڈائرکٹر ہیں لیکن الحمدللہ کہ اس کورس میں بھی پوری تندہی اور پابندی سے شریک رہے ہیں اور اُن کے والد اور میرے برادرِ خورد اقتدار احمد سلمہٗ کا ارادہ ہے کہ اپنی اولاد میں سے انہیں دین کی خدمت کے لئے بالکلیہ وقف کر دیں - اللہ تعالےٰ قبول حسن سے نوازے - (آمین)

ہم ان تمام ادھیڑ عمر اور نوجوان شرکاء کورس کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں اور دُعا کرتے ہیں کہ جو استعداد انہوں نے اس محنت و مشقت اور ایثار و قربانی سے حاصل کی ہے - وہ دین کی خدمت میں باحسنِ وجوہ استعمال ہو -

---

یہ تذکرہ بھی نامکمل رہے گا اور شدید حق تلفی بھی ہو گی اگر ہم یہاں اُستاذ مکرم حافظ احمد یار صاحب کا شکریہ ادا نہ کریں - جنہوں نے نہایت جانفشانی و تن دہی اور دلی لگن کے ساتھ تدریس فارسی و عربی کے فرائض سرانجام دیئے

اور اپنے شاگردوں کے دلوں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا ۔ دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں عمر دراز عطا فرمائے اور صحت و عافیت سے رکھے تاکہ وہ انجمن خدام القرآن اور قرآن اکیڈمی کے ساتھ اپنا عملی تعاون اسی طرح جاری رکھ سکیں !

اسی طرح کا ایک شکریہ واجب ہے علامہ سید غلام شبیر بخاری صاحب کے لئے جنہوں نے گاہے گاہے تکلیف فرما کر ان طالبان علم کو فارسی کی ادبیاتِ عالیہ بالخصوص مولانا رومیؒ اور علامہ اقبال مرحوم کے کلام ترجمان القرآن سے متعارف کرایا ۔

اسی طرح حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے مطابق سخت ناانصافی اور حق تلفی ہوگی اگر اُن حضرات کا بھی شکریہ ادا نہ کیا جائے جنہوں نے اس دو سالہ تدریسی اسکیم کے ضمن میں انجمن کے ساتھ خصوصی مالی تعاون کیا جس کے بغیر ظاہر ہے کہ انجمن لگ بھگ پندرہ ہزار روپے ماہانہ کے اس اضافی خرچ کو کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی تھی ۔ اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر عطا فرمائے ۔ اور آئندہ کے لئے پہلے سے بھی بڑھ چڑھ کر انفاق کی توفیق دے ! ـــــ ویسے بھی ظاہر ہے کہ آئندہ سال موجودہ کلاس کی تعلیم کا دوسرا سال ہوگا اور ایک نیا گروپ پہلے سال کی تدریس کا آغاز کرے گا جس سے انجمن پر مالی بار لازماً زیادہ ہو جائے گا ۔ بہرحال راقم الحروف کا یہ تجربہ ہے کہ آج تک اُس کا کوئی کام سرمائے کی کمی کے باعث نہیں رُکا ۔ اصل ضرورت مردانِ کار ـــــ اور اُن میں خلوص و اخلاص کی ہے ، مالی وسائل تو حسبِ ضرورت فراہم ہو ہی جاتے ہیں ۔

اس موقع پر یاد آیا کہ لگ بھگ چھ ماہ قبل جب پاکستان کے اخبارات میں اس دو سالہ تدریسی کورس پر چہ میگوئی کا سلسلہ جاری تھا اور بعض حضرات کی تحریروں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سخت اچنبھے میں ہیں کہ ڈاکٹر اسرار احمد ایسے درویش فقیر منش کے پاس اتنا سرمایہ کہاں سے آگیا کہ وہ ایک ایک ہزار

اور آٹھ آٹھ سو روپے وظیفہ دینے کو تیار ہے۔ چنانچہ کچھ لوگوں نے حسبِ عادت، کچھ اشارے کنائے بھی امریکی، یا سعودی امداد کی بات (یعنی ڈالر پیٹرو ڈالر) بھی کی تھی تو اس کے ضمن میں تو ذہن بے ساختہ منتقل ہوا تھا سورۂ منافقون کی اس آیۂ مبارکہ کی جانب:

هُمُ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ لَا تُنْفِقُوْا عَلٰى مَنْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ حَتّٰى يَنْفَضُّوْا

وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ

وَلٰكِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ لَا يَفْقَهُوْنَ ۝

یہ بات تو برسبیل تذکرہ قلم پر آ گئی، اصل میں عرض یہ کر رہا تھا کہ اُن دنوں محترم ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی (ایبٹ آباد) کا ایک خط راقم کے نام آیا تھا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ "تم مولانا ابو الکلام آزاد اور اُن کے قائم کردہ 'دار الارشاد' کا نام تو لیتے ہو لیکن کیا انہوں نے بھی وظائف دیتے تھے ـــ اور کیا معاوضے اور تنخواہ پر ایسا عظیم الشان اور جلیل القدر کام ہو سکتا ہے؟" (روایت بالمعنیٰ) اس وقت تو میں نے اُن کے ادب و احترام کے باعث انہیں اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا لیکن ـــ آج اُن کی اور ان کی طرز پر سوچنے والے دوسرے حضرات کی خدمت میں عرض ہے کہ دیکھ لیجئے! ہماری اس اسکیم کے ۳۱ بلکہ (دو بچیوں سمیت) ۳۳ شرکاء میں سے صرف ۱۲ متوظّف ہیں اور ۱۹ بلکہ ۲۱ غیر موظّف - اس میں ہرگز کوئی شک نہیں ہے کہ اصل بات اسی کی ہے کہ لوگوں میں اس درجہ جذبہ (MOTIVATION) پیدا کر دیا جائے کہ وہ ایثار اور قربانی سے کام لیں اور حتی الامکان رضا کارانہ بلا معاوضہ خدمات سرانجام دیں ـــ لیکن اس 'نصب العین پسندی' یعنی (IDEALISM) کے ساتھ ساتھ ہمیں واقعیت پسندی یعنی (REALISM) کے دامن کو بھی ہاتھ سے نہیں چھوڑ دینا چاہیئے - ہمارے یہاں کے معاشی و معاشرتی حالات میں کتنے نوجوانوں کے لئے یہ بالفعل قابل عمل ہے کہ وہ اپنی کالج اور یونیورسٹی کی تعلیم کی تکمیل کے بعد خالص دین کے علم کی تحصیل بھی اپنے ذاتی اخراجات خود

برداشت کرتے ہوئے کرسکیں - ظاہر ہے کہ اکثر حالات میں قابل عمل (PRACTICABLE) شکل یہی ہے کہ اس کام کی ابتدا کو آسان بنایا جائے پھر اُن میں سے جو واقعتہً اپنے اندرونی جذبہ سے متحرک (MOTIVATE) ہو جائیں گے ـــــ وہ ان شاء اللہ فاقے برداشت کرکے بھی کام کرتے رہیں گے!

اب ان شاء اللہ العزیز ۱۰ رشوال المکرم ۱۴۰۵ھ سے اس کلاس کے سالِ دوم کی تدریس شروع ہو جائے گی اور سالِ اوّل کی ایک دوسری کلاس کا آغاز ہو جائے گا۔ جو حضرات اس میں خود شرکت کے خواہاں ہوں یا اپنے اعزّہ و اقارب میں سے کسی کو داخل کرانا چاہیں وہ نوٹ فرمالیں کہ:-

(۱) جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا ہماری اوّلین خواہش یہی ہے کہ کھاتے پیتے صاحبِ حیثیت حضرات اپنے نوجوان بیٹوں میں سے جو ایم اے، ایم ایس سی وغیرہ یا بی اے، بی ایس سی وغیرہ سے فارغ ہوئے ہوں انہیں دو سال کے لئے اس کورس میں داخل کرائیں اور اس دوران ان کے جملہ اخراجات خود برداشت کریں - انہیں سوچنا چاہیئے کہ اللہ تعالےٰ کی جانب سے اُن پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ اپنی اولاد کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام کریں - اور اس کے لئے وہ قیامت کے دن جوابدہ ہوں گے - اب یہ کسقدر کوتاہی ہے کہ اُن کی دُنیا بنانے کے لئے دنیوی اور فنّی تعلیم پر تو ہم نے اُن کی عمروں کے پندرہ پندرہ سولہ سولہ سال بھی لگائے اور لاکھوں روپیہ بھی صرف کیا اور دینی تعلیم و تربیت کے لئے دو سال اور اُس کے اخراجات بھی ہمیں بہت بھاری نظر آئیں -

اس ضمن میں غیروں سے عبرت حاصل کرنے کے لئے یہ حوالہ بہت کافی ہوگا کہ راقم الحروف کے علم میں اپنے گذشتہ سفرِ امریکہ کے دوران یہ بات آئی کہ وہاں عیسائیوں کے ایک جدید فرقے "مورمن" (MORMANS) کے لوگوں نے یہ قانون بنا رکھا ہے کہ اُن کا ہر جوان لڑکا اور ہر جوان لڑکی ہائی اسکول سے فراغت کے بعد (واضح رہے کہ اُن کا ہائی اسکول ہمارے ایف اے اور ایف ایس سی کے

برابر ہے) یونیورسٹی کی تعلیم کا آغاز کرنے سے قبل مذہبی تعلیم و تربیت کے ایک دو سالہ کورس کی لازماً تکمیل کرے گا۔

دیکھ کعبے میں شکستِ رشتۂ تسبیحِ شیخ
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ!

(۲) تاہم اُن حقائق کے پیشِ نظر جو اوپر بیان ہو چکے ہیں انجمن اپنے پیشِ نظر مقاصد کی تکمیل کے لئے اپنے وسائل کی حد تک مستحق طلبہ کو وظائف بھی دے گی۔ اس ضمن میں حسبِ ذیل امور پیشِ نظر رہنے چاہئیں:

ا۔ اس میں اصلاً ایم اے اور ایم ایس سی (کم از کم سیکنڈ ڈویژن) نوجوانوں ہی کی شمولیت پیشِ نظر ہے (ایم بی، بی ایس۔ بی ایس ای انجینئرنگ بی ڈی ایس، بی اے ایل ایل بی اور بی کام، سی اے (انٹر) پاس لوگ بھی ان ہی کے مساوی سمجھے جائیں گے۔ البتہ ایم اے اسلامیات صرف وہی شامل ہو سکیں گے جن کی اچھی فرسٹ کلاس ہو (بصورت دیگر وہ وظیفہ کے اعتبار سے بی اے، بی ایس سی کے مساوی شمار ہوں گے)

ب۔ تبعاً اس میں ایک محدود تعداد میں بی اے بی ایس سی (II ڈویژن) اور خصوصی استعداد رکھنے والے ایف اے اور ایف ایس سی (II ڈویژن) کو بھی موقع دیا جائے گا۔

ج۔ ماہانہ وظیفے کی مقدار ایم اے، ایم ایس سی طلبہ کے لئے ایک ہزار روپے ماہانہ۔ بی اے، بی ایس سی کے لئے ۸۰۰ روپے ماہانہ۔ اور ایف اے، ایف ایس سی کے لئے ۶۰۰ روپے ماہانہ ہوگی جس میں سے ایک چوتھائی (۲۵٪) رقم بطور ضمانت انجمن کے پاس جمع رہے گی۔ اور طالبعلم کے کورس کے درمیان میں خود چھوڑ کر چلے جانے یا اکیڈمی کی انتظامیہ کی جانب سے اخراج کی صورت میں بحق انجمن ضبط کر لی جائے گی۔ کامیابی کے ساتھ کورس کی تکمیل کی صورت میں یہ رقم طالبعلم کو یکمشت ادا کر دی جائے گی۔!

د۔ وظیفے کے حقدار اصلاً وہی نوجوان ہوں گے جو ہمہ وقت اور ہمہ تن دین

کی خدمت کا عزم کر چکے ہوں اور کم از کم اس کورس کے دوران کوئی دوسرا شغل (بالخصوص مالی طور پر منفعت بخش) نہ رکھیں۔ چنانچہ انہیں صبح ۸ تا ایک (پانچ گھنٹے) اور شام کو عصر تا عشاء (لگ بھگ چار گھنٹے) اکیڈمی میں موجود رہنا ہوگا۔ قوم کی موجودہ عمومی اخلاقی حالت اور پابندی اور تسلسل کے ساتھ کام کرنے کی عادت کے فقدان کے پیش نظر صبح کے اسباق یا شام کے پروگراموں سے غیر حاضری پر جرمانے عائد کئے جائیں گے۔

ھ۔ اس کورس میں انجمن کے مقاصد سے دلچسپی رکھنے والے حضرات کی جز وقتی طور پر شمولیت کی بھی گنجائش رکھی گئی ہے۔ یعنی صبح ۸ تا ایک صرف اسباق میں شرکت۔ یہ حضرات تدریس کے اوقات کے علاوہ کا ملتہً آزاد ہوں گے جو ACADEMIC یا EARNING مشغلہ چاہیں رکھیں۔ یہ لوگ اصلاً غیر موظف ہونگے۔ یعنی ان کو انجمن کی جانب سے کوئی وظیفہ نہیں دیا جائے گا۔ لیکن نظم اور ڈسپلن قائم رکھنے اور باقاعدگی برقرار رکھنے کے پیش نظر اسباق سے غیر حاضری کا جرمانہ یہ حضرات بھی ادا کریں گے۔

و۔ ان میں سے ایک محدود تعداد میں استثنائی طور پر مستحق لوگوں کو وظیفہ بھی دیا جا سکے گا جو تینوں درجوں کے شرکاء کا علی الترتیب اپنے اپنے درجے کے نارمل وظیفے سے نصف ہوگا۔ البتہ ان سے غیر حاضری کا جرمانہ پورا وصول کیا جائے گا۔

ز۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس تدریس کے دوران قواعد و ضوابط کی پابندی سختی سے کرائی جائے گی۔ گویا ڈسپلن سخت برقرار رکھا جائے گا۔ شرکت کے خواہاں حضرات اس کے لئے ذہناً اپنے آپ کو تیار کر کے آئیں۔

آخر میں یہ بات نوٹ کر لی جائے کہ نئے سال کے داخلے کے لئے درخواستیں تعلیمی اسناد کی نقول اور مالی حالات کی تفصیلات کے ساتھ انجمن کے دفتر واقع قرآن

بقیہ صفحہ ۴۱ پر

سلسلۂ تقاریر الٓـمّٓـر

سُورَۃُ الرَّعد

—— ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم! نحمدہٗ ونصلّی علی رسولہ الکریم ۔ —— امّا بعد

فَاَعوذ باللہ من الشیطٰن الرّجیم ـ بِسمِ اللّٰہِ الرّحمٰن الرّحیم ؕ

الٓمّٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ؕ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ اَللّٰهُ الَّذِيْ رَفَعَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ يُدَبِّرُ الْاَمْرَ يُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ بِلِقَآءِ رَبِّكُمْ تُوْقِنُوْنَ ۝ اٰمنتُ باللّٰہِ صَدَقَ اللّٰہُ العَظیم ۔

قرآن حکیم کی دو سورتوں کا آغاز چار چار حروفِ مقطعات سے ہوتا ہے۔ ایک 'سورۂ رعد' اور دوسری 'سورۂ اعراف' —— ان میں سے سورۂ 'رعد' الٓر سیریز کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ لہٰذا پہلے اس کے بارے میں گفتگو ہوگی۔

یہ سورۂ مبارکہ ۴۳ آیات اور ۶ رکوعوں پر مشتمل ہے۔ اپنے اسلوب کے اعتبار سے اور مضامین کے اعتبار سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت مکّی دور کے بالکل اواخر میں نازل ہوئی۔ اس کی بعض آیات میں معنوی اور لفظی اعتبار سے سورۃ بقرہ کی بعض آیات سے بڑی گہری مناسبت اور مشابہت ہے۔ پھر یہ کہ اگر سورۃ الحجر سے سورۃ الرعد کا تقابل کیا جائے تو تعدادِ رکوع کے اعتبار سے دونوں بالکل ہم پلّہ ہیں۔ یعنی دونوں سورتیں چھ چھ رکوعوں پر مشتمل ہیں لیکن سورۃ الحجر کی آیات کی تعداد ۹۹ ہے اور سورۃ الرعد کی آیات کی کل تعداد ۴۳ ہے۔

یہ سورۃ 'الٓمّٓرٰ' سے شروع ہوتی ہے۔ ان حروفِ مقطعات کے بارے میں حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی رائے یہ ہے کہ یہ حروف مخفّف ہیں ایک مکمل جملے کے اور وہ جملہ ہے " اَنَا اللّٰہُ اَعْلَمُ وَاَرٰی" یعنی میں اللہ سب سے بڑھ کر جاننے والا اور

ہوں اور دیکھ بھی رہا ہوں (وَاللّٰہُ اَعْلَمُ) قرآن مجید کی دوسری بہت سی مکی سورتوں کے اسلوب کے مطابق اس سورۂ مبارکہ کے آغاز میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اور قرآن مجید کی حقانیت کا ذکر ہے اور اختتام بھی اسی مضمون پر ہوا۔ آغاز میں ارشاد ہوتا ہے:

الٓمّٓرٰ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ ۭ وَالَّذِيْٓ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ الْحَقُّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

"یہ کتاب الٰہی کی آیات ہیں اور (اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) جو کچھ آپؐ پر آپؐ کے رب کی طرف سے نازل کیا جا رہا ہے، وہ سرتاسر حق ہے۔ لیکن اکثر لوگ سمجھتے نہیں، جانتے نہیں۔"

اور آخری آیت یہ ہے:

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَسْتَ مُرْسَلًا ۝

"(اور اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم) یہ کفر و انکار کی روش اختیار کرنے والے یہ کہتے ہیں کہ آپؐ ہرگز رسول نہیں ہیں۔"

قُلْ كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًۢا بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۝

"کہہ دیجئے! کہ میرے اور تمہارے مابین اللہ کافی ہے بطور گواہ۔"

وہ جانتا ہے۔ بلکہ آپؐ کی صداقت اور آپؐ کی نبوت اور رسالت کا سب سے بڑا شاہد اور سب سے بڑا گواہ خود اللہ ہے ـــــ اور وہ بطور گواہ کافی ہے۔ ہاں ایک اور گواہی بھی ہے۔

وَمَنْ عِنْدَهٗ عِلْمُ الْكِتٰبِ ۝

"وہ لوگ کہ جن کے پاس سابقہ کتب سماویہ کا علم ہے۔"

وہ بھی خوب جانتے ہیں کہ آپؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اس میں اشارہ ہو رہا ہے علماءِ یہود کی طرف جن کی بارے میں سورۂ بقرہ میں ارشاد ہوا۔ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ۔ وہ آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایسے پہچانتے ہیں جیسے کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔ اور اسی کی طرف اشارہ ہوا اس سورۂ مبارکہ کی آخری آیت میں بھی۔

پہلے رکوع میں پہلی آیت کے بعد چند آیات میں توحید اور معاد کا مضمون بیان ہوا ہے۔ اور اس کے ضمن میں ایک عجیب پیرایۂ بیان ہے۔

وَاِنْ تَعْجَبْ فَعَجَبٌ قَوْلُهُمْ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا ۭ ءَاِنَّا لَفِيْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ۭ

اگر کسی کو تعجب کرنا ہی ہے تو قابلِ تعجب تو قول ان کا ہے کہ جب ہم مٹی ہو جائیں گے تو کیا ہمیں دوبارہ از سرِ نو تخلیق کر لیا جائے گا۔ یعنی بعث بعد الموت میں تعجب نہیں ہے بلکہ تعجب کیا جانا چاہیئے ان لوگوں کے قول پر جو اسے محال سمجھ رہے ہیں، ناممکن سمجھ رہے ہیں۔ اس لئے کہ یہ بعث بعد الموت اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور اگر کوئی شخص اللہ کو مانتا ہے تو اسے یہ ماننا پڑے گا کہ وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ (یعنی ہر چیز پر قادر) ہے۔

اب اگر اللہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قدیر ہے تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لئے مرنے کے بعد کسی کو دوبارہ پیدا کرنا قطعاً کوئی مشکل کام نہیں ہونا چاہیئے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِرَبِّھِمْ۔ یہ لوگ جو آخرت کا انکار کر رہے ہیں، بعث بعد الموت کا انکار کر رہے ہیں، وہ درحقیقت اپنے رب کا انکار کر رہے ہیں۔ اس لئے کہ اگر یہ لوگ اس کی قدرتِ کاملہ کا انکار کر رہے ہیں تو یہ واضح رہنا چاہیئے کہ اللہ کی کسی صفت کا انکار بھی اس کا مکمل انکار ہے۔ درحقیقت یہ لوگ اللہ کو نہیں مانتے، خدا پر ان کا یقین نہیں ہے۔ ورنہ اگر کوئی شخص اللہ کو مانے جیسا کہ ماننے کا حق ہے تو پھر اس کے لئے معاد (یعنی آخرت) کے تسلیم کرنے میں قطعاً کوئی دشواری اور دقت نہیں ہو سکتی۔

اس سورت میں انسانی تہذیب و تمدن یا یوں کہئے کہ انسانی اجتماعیات کے ضمن میں دو نہایت اہم اصول بیان ہوئے ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ عمرانیاتِ قرآنی (QURANIC SOCIALOGY) کے دو نہایت اہم اصول (CARDINAL PRINCIPLES) ہیں۔ جو اس سورۂ مبارکہ میں وارد ہو رہے ہیں۔ ان میں سے پہلا یہ ہے کہ

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ۔

"اللہ تعالیٰ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا، جب تک وہ خود اپنے نفوس کی کیفیت کو بدلنے (اپنے آپ کو تبدیل کرنے) پر آمادہ نہ ہو"

یہ مضمون اس قدر اہم ہے کہ قرآن مجید میں سورۂ انفال میں بھی وارد ہوا ہے لیکن وہاں اسلوب ذرا مختلف ہے۔

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ لَمْ یَکُ مُغَیِّرًا نِّعْمَۃً اَنْعَمَھَا عَلٰی قَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ

یہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کسی قوم کو جو نعمت عطا فرماتا ہے اسے کبھی زائل نہیں

فرمایا کرتا۔ جب تک وہ قوم اپنے آپ کو بدل نہ دے"
یعنی اگر قوم کی نفسیاتی کیفیات ہی تبدیل ہو جائیں تو پھر اللہ تعالیٰ اپنی نعمتیں بھی سلب فرمالیا کرتا ہے۔ اس آیت کا ایک تو بالکل سرسری سا مفہوم ہے جسے کسی شاعر نے بڑی خوبصورتی سے ایک شعر میں پرو دیا ہے ؎

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس آیۂ مبارکہ کا مفہوم اس سے کہیں گہرا ہے۔ جو بات اس میں بیان کی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ کسی قوم کے جو ظاہری حالات ہیں وہ فیصلہ کن نہیں ہوا کرتے۔ اصل فیصلہ کن چیز لوگوں کے غور و فکر کے زاویئے، ان کے سوچنے کے انداز، ان کے قلب و ذہن کی باطنی کیفیات اور ان کی وہ اقدار (یعنی VALUE SYSTEM) ہوا کرتی ہیں کہ جن پر ان کے طرزِ عمل اور ان کی دوڑ دھوپ کا دارومدار ہے۔ جب تک یہ چیزیں نہیں بدلتیں کسی قوم کی حالت نہیں بدل سکتی۔

محض ظاہری ٹیپ ٹاپ اور کچھ اوپری سی تبدیلیوں سے کسی قوم کے حالات کے اندر کوئی بنیادی اور پائیدار تبدیلی نہیں لائی جا سکتی۔ یہی بات ہے جو علامہ اقبال نے قرآن حکیم کے بارے میں کہی ہے۔ اور بڑے خوبصورت انداز میں کہی ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جہاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

یعنی جب یہ قرآن کسی کے باطن میں سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب آجاتا ہے۔ اس کے سوچنے کے انداز بدل جاتے ہیں۔ اس کے نظریات تبدیل ہو جاتے ہیں۔ اس کی اقدار بدل جاتی ہیں۔ پہلے زندگی سب سے زیادہ محبوب شے تھی۔ اب موت عزیز تر ہو جاتی ہے۔ یہ اندرونی انقلاب ہے۔ یہی باطنی انقلاب ہے جو کسی عالمگیر انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ لیکن جب تک یہ انقلاب برپا نہ ہو جائے محض ظاہری تبدیلیوں سے اسلامی انقلاب دنیا میں نہیں لایا جا سکتا۔

دوسرا اصول، اور وہ بھی بہت اہم ہے، تاریخ و تمدن کے فلسفے کے بڑے ہی اہم مسئلے سے بحث کرتا ہے۔ انسانوں نے اپنے حالات پر جب غور کیا اور تاریخ پر جب غور کیا تو نظر آیا کہ

ایک مسلسل کش مکش اور ایک مسلسل تصادم نظر آتا ہے۔ اس کش مکش اور تصادم کو اس دور میں مارکس نے دعویٰ اور جواب دعویٰ اور ان کا باہمی تصادم یعنی Thesis اور Anti Thesis اور بعد میں اس کے نتیجے میں SYNTHESIS کے وجود میں آنے سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن حکیم اس کش مکش کو حق و باطل کی کش مکش قرار دیتا ہے۔ کش مکش اور تصادم تاریخ انسانی میں یقیناً رہا ہے اور اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ لیکن یہ تصادم اور کش مکش حق و باطل کے مابین ہے۔ بقول علامہ اقبالؒ ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اس کش مکش کو قرآن مجید تعبیر فرماتا ہے کہ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ الْحَقَّ وَالْبَاطِلَ یعنی اسی طرح اللہ تعالیٰ حق کو باطل سے ٹکراتا ہے۔ لیکن اس ٹکراؤ میں دو تمثیلیں دی گئیں کہ جیسے کبھی بارش ہوتی ہے اور سیلاب آتا ہے تو اس سیلاب پہ بہت سا جھاگ بھی ہوتا ہے۔ یا اگر تم دھاتوں کو زیورات بنانے کے لئے یا کسی اور غرض سے پگھلاتے ہو تو اس عمل میں بھی ایک جھاگ اوپر آجایا کرتا ہے۔ یہ جھاگ دیکھنے میں تو بہت نمایاں ہوتا ہے لیکن اس کی حقیقت کچھ نہیں ہوتی۔ فرمایا: فَاَمَّا الزَّبَدُ فَيَذْهَبُ جُفَآءً "وہ جھاگ جو ہے وہ تو ختم ہو جاتا ہے"، یعنی اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْاَرْضِ

"جو چیز لوگوں کے لئے منفعت بخش ہوتی ہے، مفید ہوتی ہے، وہ زمین میں ٹھہرتی ہے ثبات کے ساتھ"

اس تصادم کے نتیجے میں جو بھی صورت ایسی ظہور میں آئے گی جو نوع انسانی کے حق میں بحیثیت مجموعی مفید اور منفعت بخش ہو فی الواقع ثبات اور دوام اسی کو ہوگا۔ باقی یہ کہ مختلف حالات میں اور مختلف اوقات میں ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز بظاہر اپنا خوب رنگ جمائے۔ اس جھاگ کے مانند جو بظاہر چھائی ہوئی نظر آتی ہے لیکن اگر اس میں نوع انسانی کے لئے حقیقی منفعت نہیں ہے تو وہ چیز پائدار نہ ہوگی، دنیا میں قائم نہ رہ سکے گی۔ قائم رہنے والی چیز وہی ہے جو انسانوں کے لئے منفعت بخش ہے۔

ایک آخری بات جو اس سورۂ مبارکہ کی ایک عظیم آیت میں آئی ہے جو درحقیقت

نفسیاتِ انسانی کی ایک بڑی گہری حقیقت سے بحث کرتی ہے اور نفسیاتی امراض کے علاج معالجے میں ہمارے جدید معالجین کو جو ناکامی ہو رہی ہے اس کے اصل سبب کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ۔

آگاہ ہو جاؤ دلوں کو سکون اگر مل سکتا ہے تو صرف اللہ کی یاد سے، کسی بھی مصنوعی تدبیر سے خواب آور یا سکون بخش گولیوں (TRANQUILIZER اور SEDITIVE) سے انسان کے قلب کو اطمینان اور سکون حاصل نہیں ہو سکتا۔ آپ کچھ دیر کے لئے اس کو بے حس کر سکتے ہیں سُلا سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دل کو راحت اگر مل سکتی ہے، سکون حاصل ہو سکتا ہے تو اللہ پر ایمان اور یقین سے اور ذکرِ الٰہی سے۔ اطمینانِ قلب کے لئے اس کے علاوہ کوئی مؤثر نسخہ موجود نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اپنے ذکر کی توفیق اور اس کی لذت عطا فرمائے۔ اور قلبی اور ذہنی اطمینان کی دولت سے بہرہ ور فرمائے۔

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم
ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

بقیہ: تدریسی کورس کے سالِ اوّل کی روداد

اکیڈمی، ۳۶۔کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور، میں زیادہ سے زیادہ پندرہ رمضان المبارک تک پہنچ جانی چاہئیں۔ شوال کے پہلے ہفتے میں ان شاء اللہ انٹرویو لئے جائیں گے۔ اور زیادہ سے زیادہ ۱۰ شوال المکرم سے نئے سال کی تدریس کا آغاز ہو جائے گا۔ ان شاء اللہ العزیز!

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے دین متین اور کتابِ حکیم کی بیش از بیش خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

ایمان اور اسکے ثمرات و مضمرات قسط ۵

سُورۃ تغابن کی روشنی میں

ڈاکٹر اسرار احمد

آپ نے دیکھا کہ اس پہلے رکوع میں ایمانیات ثلاثہ کی تفصیل مختلف اسالیب اور پہلوؤں سے بیان ہوئی۔ آفاق و انفس کی آیات سے اللہ تعالیٰ کی توحید، اس کی صفتِ قدرت، صفتِ علم اور صفتِ حکمت پر استدلال قائم کئے گئے۔ تاریخ امم سے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کے انجام بد سے آگاہ اور خبردار کیا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی، آپؐ کی سیرت و کردار میں، آپؐ کے اسوۂ حسنہ کو بطور دلیل پیش کر کے یوم آخرت کی خبر دی گئی اور پھر ان مُسَلَّمات کے بعد دعوت دی گئی کہ قبول کرو ان حقائق کو، تسلیم کرو ان حقائق کو، مان لو کہ یہی حقیقتِ نفس الامری ہے، اس کائنات کے یہی حقائق ہیں لہٰذا اللہ پر، اس کے رسولِ امّی پر، آخری کتاب قرآن مجید پر، اور بعث بعد الموت پر ایمان لاؤ اپنے اعمال کو اللہ اور اس کے رسول کی تعلیمات کے مطابق درست کر لو تاکہ یوم الجمع، جمع کرنے کے دن، ہار کی بجائے جیت سے، نامرادی کی بجائے بامرادی سے، ناکامی کی بجائے کامیابی سے، خسران کی بجائے فوز و فلاح سے ہمکنار اور بہرہ ور ہو سکو اور نارِ جہنم سے چھٹکارا حاصل کر کے جنّتِ عدن میں داخل ہو سکو ــــــ

اب ہم دوسرے رکوع کا مطالعہ شروع کرتے ہیں جس میں ایمان کے مقتضیات، متضمنات، مقدّرات اور ثمرات و نتائج کا ذکر ہے اور ایمان کے مضمرات کو کھولا گیا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایمان ایک خاص فکر ہے، جس سے انسان کا ایک نقطۂ نظر بننا چاہیئے اور جب انسان کا زاویۂ فکر (Mental Attitude) تبدیل ہو جائے، اس کا نقطۂ نظر بدل جائے تو اس کی پوری زندگی میں ایک انقلاب آجانا چاہیئے۔ اگر یہ انقلاب رونما نہیں ہوتا۔ اسے

دو اور دو چار کی طرح سمجھئے۔ تو دو ہی امکانات ہیں یا تو یہ کہ وہ ایمان ابھی صرف زبان تک ہے۔ اس نے انسان کے فکر میں جڑیں نہیں پکڑیں اور وہ انسان کے قلب میں نہیں جما۔ میرے نزدیک کسی انسان کے فکر میں ایمان کا جڑ پکڑنا مقدم ہے اور آخری منزل یہ ہوتی ہے کہ وہ دل میں جم جائے۔ دل میں جم جانے کے بعد یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ اس کے قول و عمل میں کوئی فرق رہے لیکن اگر فکر کے اندر بھی راسخ ہو جائے تو ایک تبدیلی کا آغاز ہو جانا چاہئے اور اگر نہیں ہو رہا تو وہ اس بات کی دلیل قطعی ہے کہ ایمان صرف زبان کی نوک پر ہے۔ نہ ابھی اس نے ذہن میں جڑیں پکڑیں، نہ ہی وہ فکر میں راسخ ہوا۔ نہ ہی وہ قلب میں اترا اور نہ ہی اس نے ابھی ایک یقین کی صورت اختیار کی۔ ایک امکان تو یہ ہے۔ دوسرا امکان یہ ہے کہ وہ شخصیت ہی مریض ہو، ایک Diseased Personality ہو یا اس کی مثال اس زمین کی سی ہو کہ جو بنجر ہو، فاسد ہو، جس میں بہترین بیج بھی بار آور نہیں ہوتا۔ اچھے سے اچھا بیج بھی برگ و بار نہیں لائے گا۔ اور یہ زمین بیج تک کو ضائع کر دے گی، تو اس طرح مریض شخصیت، فاسد شخصیت کے عمل سے ایمان کا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ اگر فطرت اپنی صحت پر برقرار ہے تو ابھی ایمان زبان کی نوک پر ہے، نہ وہ ذہن میں اترا، نہ فکر میں رچا بسا، اور نہ قلب میں اترا اور نہ اس نے یقین کی صورت اختیار کی۔ تیسرا کوئی امکان اور کوئی Alternative نہیں۔ اس کو اچھی طرح ذہن میں رکھئے۔ اب ذرا غور کیجئے۔ ایک شخص اس کائنات کو کوئی اتفاقی حادثہ نہیں سمجھتا، کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں سمجھتا، کسی رام کی لیلا نہیں جانتا، بلکہ ایک خدائے واحد، علیم و خبیر، قدیر و حکیم، کی اس کائنات کو تخلیق سمجھتا ہے۔ اپنے متعلق یہ نہیں سمجھتا کہ میں یونہی اچانک اور بلا مقصد وجود میں آ گیا ہوں، بلکہ سمجھتا ہے کہ میرا ایک خالق ہے جس نے مجھے بالحکمت پیدا کیا ہے اور بالحق پیدا کیا ہے۔ اسے یقین بھی ہے کہ اصل زندگی موت کے بعد کی زندگی ہے، اصلی فیصلے وہاں ہونگے بازپرس کا معاملہ تو وہاں طے ہوگا۔ اسے اس بات کا ایقان بھی ہے کہ میری راہنمائی کے لئے میرے اس خالق نے ایک سلسلۂ وحی و نبوت اور رسالت جاری فرمایا ہے اور کتابیں نازل کی ہیں۔ اگر واقعتاً یہ باتیں ذہن میں جم جائیں، فکر میں رچ بس جائیں اور اگر واقعتاً ان باتوں پر دل میں یقین پیدا ہو جائے تو کیا اس کی ماقبل اور مابعد کی زندگی میں زمین و آسمان کا فرق واقع نہیں ہونا چاہئے۔ کہاں وہ سوچ اور کہاں یہ سوچ! کہاں یہ خیال کہ اتفاقی حادثہ اس کائنات

اور اس کے موجودات کی تخلیق کا باعث ہے اور کہاں یہ خیال کہ نہیں بلکہ ایک علیم وخبیر، قدیر وحکیم ہستی نے اس کائنات اور موجودات کو پیدا کیا ہے۔ کہاں یہ خیال کہ موت پر زندگی ختم۔ کوئی حساب وکتاب، جزا وسزا، کوئی حشر ونشر نہیں۔ اور کہاں یہ خیال کہ موت تو دراصل حقیقی زندگی کا شاہد رہ ہے۔ یہاں سے آغاز ہوتا ہے اصل اور حقیقی زندگی کا۔ کہاں یہ خیال کہ ہم تو بس اپنی جبلّت کے غلام ہیں۔ یا جو کچھ ہماری عقل میں آجائے، اس کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ اور کہاں یہ خیال کہ نہیں میری ہدایت و راہنمائی کا سامان تو وہ ہے جو میرے خالق اور میرے رب کی طرف سے کر دیا گیا تو معلوم ہوا اس زاویۂ فکر اور نقطۂ نظر سے غور میں مشرق ومغرب کا فرق واقع ہو جانا چاہیئے ـــــ اسی بات کو اس رکوع میں مختلف پہلوؤں سے بیان کیا جا رہا ہے۔ اس تمہید کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اب دوسرے رکوع کا مطالعہ شروع کیجئے۔ فرمایا " مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ اگر خدا کو مانتے ہو، علیم خدا کو، خبیر خدا کو، حکیم خدا کو مانتے ہو تو اس ماننے اور تسلیم کرنے سے پہلی بات یہ لازم آئے گی" کہ نہیں پڑتی کوئی پڑنے والی (مصیبت) مگر اللہ کے اذن سے"۔ یہ لفظی ترجمہ ہوا۔ یعنی کوئی مصیبت، کوئی تکلیف، کوئی نقصان، کوئی حادثہ، کوئی موت، کوئی بھی وہ افتاد جو تم کو ناخوش گوار اور ناپسند ہو ظاہر بات ہے کہ وہ بغیر اذن خداوندی نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ خدا قادر ہے، وہی اس کائنات کے نظام کا مدبّر ہے، وہ ہی اس کو چلا رہا ہے تو اس کے اذن کے بغیر کوئی واقعہ کیسے ظہور میں آجائے گا! جو کچھ ہوا یقیناً اسی کے اذن کے تحت ہوا۔ اگر تمہیں یہ معرفت حاصل ہو گئی اور یہ بات بھی تم جانتے ہو کہ اس کے ہاتھ میں خیر ہی خیر ہے۔ بِيَدِهِ الْخَيْرُ۔ اس کی مصلحتیں اور حکمتیں ہیں۔ ہم ان کو سمجھ نہیں سکتے۔ لیکن وہ جانتا ہے کہ کس کام میں کیا مصلحت وحکمت ہے۔ اس یقین وایقان کے ساتھ ایمان کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ تسلیم ورضا کی کیفیت پیدا ہونی چاہیئے۔ لہٰذا آگے فرمایا " وَمَنْ يُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ يَهْدِ قَلْبَهٗ " اور جو کوئی واقعتاً اللہ پر ایمان لاتا ہے، اللہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے " کس بات کی ہدایت دیتا ہے؟ تسلیم ورضا کی ہدایت دیتا ہے۔ سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے، یہ خو پیدا کر دیتا ہے اور کہ ہر چہ ساقیٔ ما ریخت عین الطاف است۔ میرا پروردگار میرے لئے جو بات بھی طے کر دے، جو بھی اس کا فیصلہ ہو، وہ مجھے منظور ہے۔ وہ میرا مولیٰ ہے، آقا ہے، میرا پروردگار ہے۔ میرا مالک اور خالق ہے۔ مجھے

اس کا ہر فیصلہ بسر و چشم قبول ۔ بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ کیفیت ہونی چاہئے کہ ؎

نہ شود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی ۔

تسلیم و رضا کی یہ کیفیت جب تک انسان میں پیدا نہیں ہوتی، اس وقت تک حقیقت ایمان سے وہ بہت بعید ہے ۔ یَھْدِ قَلْبَہٗ ط کی اس شرح میں ممکن ہے کہ آپ حضرات یہ سمجھیں کہ میں نے کچھ تجاوز کیا ہے ۔ عبارت میں اتنی گنجائش نہیں ہے ۔ تو بطور شہادت ام المسبحات سورہ حدید کی دو آیتیں پیش کرتا ہوں جس میں اس مضمون کو کھول دیا گیا ہے اور بڑے ہی شرح و بسط کے ساتھ اس کو بیان کیا گیا ہے ۔ چنانچہ فرمایا : مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ط اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۝ لِّکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ وَاللّٰہُ لَا یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ "کوئی مصیبت نہیں آتی نہ زمین پر نہ تمہاری جانوں میں نہ باہر کے حوادث آتے ہیں اور نہ ہی تمہارے جسم میں کوئی اختلال، کوئی بیماری، کوئی عارضہ، کوئی مرض اور کوئی خرابی آتی ہے مگر یہ کہ وہ پہلے سے طے شدہ ہے، ایک کتاب میں درج ہے، فیصل شدہ ہے، اس سے پہلے کہ ہم اس کو اس دنیا میں ظاہر کریں" اور اگر تم یہ سوچو کہ ایسا کیسے ہو سکتا ہے تو ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیْرٌ ۝ "یہ اللہ کے لئے بالکل آسان ہے" اللہ کو تم نے قدیر مانا ہے، اللہ کو تم نے بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ مانا ہے ۔ ——— لہٰذا خدا کی قدرت اور خدا کے علم سے باہر کوئی چیز کیسے ہو سکتی ہے ؟ خدا کا علم کسی کام کے ظہور پر مبنی نہیں ہے ، بلکہ خدا کا علم تو اپنی جگہ علم قدیم ہے ۔ یہ بات کیوں فرمائی گئی ؟ وہاں اس کو کھول دیا لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ ط تاکہ تم افسوس نہ کیا کرو اور نہ غم کھایا کرو، اس چیز پر جو تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے، یا تمہارے ہاتھ نہ لگے اور جو کچھ خدا تمہیں دے دے اس پر اترایا نہ کرو، شیخی نہ کیا کرو ۔" اس لئے کہ یہ دونوں حالتیں دراصل آزمائش کی حالتیں ہیں، دونوں امتحان کی حالتیں ہیں کبھی وہ دے کر آزماتا ہے اور کبھی وہ چھین کر آزماتا ہے ۔ کبھی وہ تمہیں اولاد دے کر آزماتا ہے کہ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ، اور کبھی اولاد لے کر آزماتا ہے کہ تم صبر کرتے ہو کہ نہیں کرتے اور جس طرح اس کی دین پر راضی ہوئے تھے اس کے لین پر بھی اسی طرح مطمئن ہو کہ نہیں ۔ اسی بات کو سورۂ بقرہ کی آیت ۱۵۶ میں صابرین کی صفت بیان

کرتے ہوئے فرمایا" اَلَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَتْھُمْ مُّصِیْبَۃٌ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ ۝ ان صابر بندوں پر جب کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہیں کہ ہم تو اللہ ہی کے (مال اور بندے) ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں"۔۔۔ یہ نتیجہ ہونا چاہیئے ایمان کا کہ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ ط اور مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ فِی الْاَرْضِ وَلَا فِیْٓ اَنْفُسِکُمْ اِلَّا فِیْ کِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَھَا ط کوئی نہیں پڑتی پڑنے والی مگر باذن رب اور اگر یہ یقین ہو جائے کہ جو حوادث پیش آرہے ہیں، جو مجھ پر بیت رہی ہے وہ بہرحال اذنِ رب سے ہو رہا ہے اور ان کے ظہور سے پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فیصل شدہ درج کر رکھا ہے۔ اس کو اور اچھی طرح تفصیل کے ساتھ سمجھ لیجیے۔ مبادا کوئی اشکال پیدا ہو۔ ہر چیز جو آپ پر وارد ہوتی ہے اس میں دو اجزاء ہوتے ہیں۔ ایک جزء تو یہ ہے کہ کسی نے آپ کے ساتھ برائی کرنا چاہی۔ اور دوسرا جزء یہ ہے کہ وہ برائی فی الواقع آپ پر واقع ہو جائے۔ ان دو اجزاء میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کسی نے پتھر اٹھا کر آپ کو مارا' یہ ایک مرکب عمل کا ایک پہلو ہے۔

——— اس معاملے کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ وہ پتھر واقعی آپ کو آکر لگ گیا۔ وہ شخص جس نے پتھر مارا، پتھر مارنے کا مجرم ہے۔ اس کی سزا وہ خدا کے ہاں پائے گا۔ لیکن پتھر کا آکر آپ کو لگ جانا، یہ اذنِ رب پر منحصر ہے۔ اب آپ اس پتھر کے لگنے کو دو طرف منسوب کر سکتے ہیں۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس شخص نے مارا اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ خدا نے مارا۔ اگر یہ کہیں گے کہ اس شخص نے مارا تو اشتعال پیدا ہوگا، غصہ آئے گا، قصاص ہوگا، بدلہ ہوگا۔ دنیا کا قانون اور معاملہ اسی پر چلے گا۔ لیکن اگر یہ چیز پیشِ نظر رہے کہ خدا کی منشاء تھی، مرضی تھی، اور یقیناً اس میں کوئی حکمت ہے، کوئی مصلحت ہے، کوئی خیر ہے۔ تب آپ سوچئے کہ کیسا سکون پیدا ہوگا؟ نہ طبیعت میں انتشار ہے، نہ اشتعال ہے، نہ غصہ ہے، نہ انتقام کی آگ بھڑک رہی ہے کہ اگر بدلہ پر قادر نہیں ہیں تو اندر ہی اندر سلگ رہے ہیں۔ یہ ساری مصیبتیں دور ہو گئیں تھیں۔ اس علم سے کہ مجھے پتھر خدا کے مارے لگا ہے۔ اور اس نے مارا ہے تو ھُوَ مَوْلٰنَا۔ سورۃ توبہ میں اس موقعہ پر آیا ہے کہ جب مسلمانوں کو کوئی تکلیف، کوئی مصیبت، کوئی حادثہ پیش آتا تھا تو منافقین خوش ہوتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے اسی لئے پہلے ہی احتیاط کا پہلو اختیار

کر لیا تھا اور اس موقعہ پر شرکت سے گریز کیا تھا۔ ان کے اس زعمِ باطل کے جواب میں حضورؐ کو حکم ہوا کہ "قُلْ لَّنْ يُّصِيْبَنَآ اِلَّا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَنَا ۚ هُوَ مَوْلٰىنَا اے نبی آپ ان سے کہہ دیجئے ہم پر کوئی مصیبت نہیں آسکتی، نہ کوئی حادثہ پڑ سکتا ہے، مگر وہی جو اللہ تعالیٰ نے ہمارے لئے (پہلے سے) مقدر فرما دیا ہے، اور وہ ہمارا مولا ہے۔ مالک ہے، آقا ہے۔ ہمارا پشت پناہ ہے، ہمارا ہم سے بڑھ کر خیر خواہ ہے اور ہماری مصلحتوں پر ہم سے زیادہ مطلع ہے۔ لہٰذا ہم راضی برضا ہیں۔ اس کی کسی بات پر اضطراب ہو تو کیوں ہو؛ اور پریشانی ہو تو کیوں ہو؟ یہ ہے حقیقتِ اولیٰ ـــــ میں نے جو پتھر مارنے کا تجزیہ پیش کیا ہے یہ میں نے کسی درویش سے ایک درویشانہ انداز میں واقعہ سنا تھا کہ ایک درویش جا رہا تھا اور یہ صدا لگا رہا تھا "جو رب کرے سو وہ ہو، جو رب کرے سو وہ ہو" ـــــ ایک شخص نے اٹھا کر اسے ایک پتھر مارا۔ درویش نے مڑ کر دیکھا وہ کہنے لگا، مجھے کیوں دیکھتے ہو جو رب کرے سو وہ ہو۔" انہوں نے کہا مجھے تو یہ پتھر لگا ہے، خدا ہی مارے لیکن میں یہ دیکھ رہا تھا کہ بیچ میں منہ کس کا کالا ہو گیا۔ تم نے تو اپنے لئے عذاب کما لیا ہے۔ تمہیں تو جواب دہی کرنی پڑے گی۔ مجھ تک جو یہ پتھر آ پہنچا ہے اور میرے سر کو آ لگا ہے۔ یہ یقیناً میرے رب کی طرف سے ہے اور میں اس پر مطمئن ہوں۔ لیکن تم نے اپنے حق میں جو کانٹے بوئے ہیں۔ تم اس کی فکر کرو۔ یہ ہے مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ ایک بات یہاں اور سمجھ لیجئے۔ ہمارا دنیوی نظام جتنا ہے، اس کا پہلے "عمل" پر مدار ہو گا۔ جس نے پتھر مارا ہے، آپ اسے قصاص میں پتھر مار سکتے ہیں۔ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ اس دنیا کا نظام تو برقرار ہی رہے گا، قصاص کے اصول پر، یہاں یہی ضابطہ رائج ہو گا۔ کہ سزا دو، بدلہ لو، قصاص لو، وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالْاَنْفَ بِالْاَنْفِ ہر زیادتی کے لئے قصاص ہے۔ قصاص کے ساتھ یہ نظام قائم رہے گا ورنہ اشرار کو کھلی چھٹی مل جائے گی۔ لیکن یہ گفتگو کی بالکل دوسری سطح ہے۔ پہلی سطح یہ ہے کہ آپ اپنے باطن میں کیا سمجھتے ہیں؛ آپ کا معاملہ اپنے رب کیساتھ ہے؛ آپ نے اس کائنات میں حوادث کے بارے میں کیا نقطہ نظر اختیار کیا ہے؛ آپ سمجھتے ہیں کہ کوئی اپنے اختیار سے آپ کو پتھر مار سکتا ہے؛ یہ خیال ایمان باللہ کے منافی ہو گا۔ آپ سمجھتے ہیں کہ بغیر اذنِ رب یا علمِ رب

کوئی حادثہ وقوع میں آسکتا ہے؟ یہ تو خدا کا انکار ہوگیا۔ پس معلوم ہوا کہ ایمان کے حقائق اور ہیں اور قانون کی بنیاد جن چیزوں پر قائم ہوتی ہے وہ بالکل دوسری چیزیں ہیں۔ اسی قصاص کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ " وَاَنْ تَعْفُوْا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ اگر تم معاف کر دیا کرو تو تمہارے لئے اس میں بہت بھلائی ہے۔ اس پر تمہیں خدا کے ہاں اجر ملے گا — لیکن اصل اصول وہی رہے گا۔ کہ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي الْأَلْبَابِ قصاص کے اندر ہے زندگی اور عافیت، یہاں کا جو نظام ہے، وہ قصاص پر مبنی ہوگا تو ٹھیک چلے گا، ورنہ بگڑ جائے گا۔ یہ تضادات ہیں جن کو صحیح طور پر جب فکر میں جمع کیا جاتا ہے —— ، تب جاکر کہیں بات واضح ہوتی ہے کہ ایک طرف قصاص ہے، اس کی اپنی اہمیت ہے۔ ایک طرف عفو ہے اس کا اپنا مقام ہے۔ دونوں کے محل مختلف ہیں پس فرمایا " مَا أَصَابَ مِنْ مُصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَمَنْ يُؤْمِنْ بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ ۚ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ اور اللہ تو یقیناً ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ کوئی چیز اس کے علم کے بغیر وقوع پذیر نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ کی صفت علم پر اس دن میں بھی تفصیل سے گفتگو ہو چکی ہے، اس کو ذہن میں رکھئے۔ تو ایمان کی دعوت کے قبول کرنے کے بعد سب سے پہلی تبدیلی تو یہ ہوئی کہ جو کچھ انسان پر بیتے۔ اس پر شکوہ و شکایت اگر پیدا ہوگئی، یہاں تک کہ طبیعت کے اندر اگر انقباض بھی پیدا ہوگیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ تو معلوم ہوا کہ خدا کے ساتھ ابھی وہ اصل رابطہ پیدا نہیں ہوا۔ ابھی تک اس کے ساتھ جو اقل تعلق ولایت ہے، جو حاصل ایمان ہے، وہ ابھی وجود میں نہیں آیا ہے اگر یہ کیفیت ہے کہ تم نے محسوس کیا کہ تم کچھ اور چاہتے ہو۔ خدا نے کچھ اور کر دیا۔ دوئی ہوگئی۔ جب تک اپنی چاہت کو، اپنی پسند کو تج کر راضی برضائے مولا نہ ہوں گے، ایمان کا ذائقہ نہ چکھ سکو گے۔ کہ ہر چہ ساقی ما ریخت عین الطاف است۔ میرے پیالے میں میرا ساقی جو بھی ڈال دے، وہ لطف و کرم ہے، اس کا فضل ہے جو اس کی مرضی، جو اس کا فیصلہ، یہاں تو سر تسلیم خم ہے اور یہ انداز جو ہے کہ ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف۔ کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور۔ یہ انداز ایمان باللہ کے منافی ہے۔ شعر اچھا ہو کوئی داد دینا چاہے دے لے لیکن بہرحال یہ سارا فکر، فکر ایمانی سے قطعاً متضاد ہے۔ یہ جو لوگ آسمان کو مخاطب کر کے گالیاں دیتے ہیں۔

نام دھرتے ہیں ۔ فلکِ ناہنجار کہہ کر، فلک کج رفتار کہہ کر، چرخِ نیلی فام کہہ کر اور نہ جانے کیا کیا کہہ کر، تو درحقیقت اس پر دے میں (نعوذ باللہ) اللہ کو گالیاں دیجاتی ہیں ۔ اس لئے نبی اکرمؐ نے فرمایا ۔ لَا تَسُبُّوا الدَّھْرَ، اس دھر کو گالیاں مت دیا کرو، بیوقوفو! اس طرح خدا کو گالیاں دے رہے ہو ۔ اس لئے کہ دہر تو کوئی چیز ہی نہیں ہے۔ جو کچھ وقوع پذیر ہو رہا ہے اور جسے تم دہر سے منسوب کر رہے ہو وہ تو خدا کا عمل ہے۔ اس کا فیصلہ ہے ۔ لَا تَسُبُّوا الدَّھْرَ فَاِنَّ الدَّھْرَ ھُوَ اللّٰہُ ، جو کچھ تم دہر سے منسوب کرتے ہو، وہ درحقیقت خدا کی قضا و قدر ہے ۔ خدا کی مشیت ہے، خدا کا حکم ہے ۔ تو یہ گالیاں کس کو دی گئیں، ناہنجار کون ہوا ؟ کج رفتار کون ہوا ؟ فلکِ پیر کون ہوا ؟ —— ایک آیت میں ایک بات بیان ہو گئی ۔ یہ مقامات ہیں کہ جن پر صوفیاء نے بحثیں کی ہیں ان امور پر گفتگو آپ کو فقہ کی کتابوں میں نہیں ملے گی ۔ یہ باتیں قرآن و حدیث میں موجود ہیں، لیکن قرآن و حدیث سے فقہاء نے وہ باتیں لی ہیں، جو قانون، احکام اور تعزیر سے متعلق تھیں ۔ ان رموزِ عارفانہ سے انہوں نے بحث نہیں کی ہے، اس لئے کہ ان کو قانون سے بحث و گفتگو کرنی تھی اور قانون کا دائرہ ہی اور ہے ۔ ان امور پر گفتگو کی ہے ان علماء اور اولیاء نے جنہیں انسان کے باطن کی فکر تھی ۔ لہٰذا حقیقت ایمان سے بحث ان بزرگوں نے کی ہے ۔ مقام شکر کیا ہے؟ مقام صبر کیا ہے ؟ مقام تسلیم و رضاء کیا ہے ؟ راضی برضاء رب کا تقاضا اور مقام کیا ہے ؟ ان تمام مقامات سے بحث انہوں نے کی ہے ۔ ہر ایک کا دائرہ کار مختلف ہے اور اپنے قلوب کو، اپنے اذہان کو کشادہ اور وسیع کیجئے کہ ہر طرف سے جو کارآمد و مفید چیز ملے وہ لے لیجئے ۔ کوئی تعصب اگر حائل ہو گیا، نقصان اپنا ہے ۔ ان کا کچھ نہیں بگڑے گا ۔ سارا جو نقصان ہے وہ ہمارا اپنا ہے ۔

اب دوسری طرف آئیے ۔ آپ انسانی شخصیت کا تجزیہ کیجئے ۔ ایک "انا" ایک نفس انسانی کے دو پہلو ہیں ۔ ایک پہلو تو یہ کہ جو کچھ اس پر وارد ہوتا ہے، کچھ حالات، واقعات، حوادث، خوشگوار ہوں یا ناخوشگوار، اس کو چھوڑ دیجئے ۔ تو کچھ تو اس پر وارد ہوتا ہے ۔ دوسرا پہلو یہ کہ کچھ اس سے صادر ہوتا ہے ۔ کچھ افعال، کچھ اقوال، کچھ حرکتیں، تو ایک طرف ورود ہے اور ایک طرف صدور ہے ۔ انسان کی شخصیت کے یہ دو ہی پہلو (ASPECTS) ہیں ہمارا ایک انفعالی رخ ہے اور ایک ہمارا فاعلی رُخ ہے

ہے۔ کہ ہم سے کچھ صادر ہو رہا ہے۔ کچھ اعمال، کچھ افعال، کچھ اقوال، کچھ حرکتیں، کچھ اشارے یہ صدور ہے جو ہم سے ہو رہا ہے۔ پہلے حصہ میں اس سے بحث کر لی کہ جو ورود کے بارے میں ہے کہ جو کچھ تم پر بیت رہا ہے، وہ اذنِ رب سے بیت رہا ہے۔ اگر خدا کو مانتے ہو، تو یہ بھی ماننا پڑے گا۔ اب صدور کا ذکر ہو رہا ہے۔ ہم سے جو کچھ صادر ہو رہا ہے، اس کے ایمان کے لازمی تقاضے کے طور پر دو نتیجے نکلنے چاہئیں۔ پہلا یہ کہ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ج خدا کو مانا رسول کو مانا، تو اب لازم ہے کہ جو بھی عمل تم سے صادر ہو، وہ اس سانچے میں ڈھل کر صادر ہو جو اللہ اور اس کے رسول نے متعین کیا۔ یہ دو اور دو چار کی طرح لازمی نتیجہ ہے۔ خدا کو مانتے ہو تو رسول کو مانتے ہو۔ انہوں نے ایک نظام بنا دیا، ایک سانچہ ڈھال دیا، ہر کام کے لئے ایک شکل متعین کر دی ہے۔ تمہارے تمام داعیات اور مقتضیات، جو تمہاری فطرت و جبلت اور جسم کے اندر ہیں۔ جن کا اللہ سے بڑھ کر جاننے والا کوئی نہیں۔ خالق وہ ہے لہٰذا تمہاری فطرت کا سب سے بڑا عالم وہی ہے۔ اس نے ہر داعیہ اور ہر تقاضے کا ایک حق متعین کر دیا ہے۔ یہاں تک کہ تمہاری شہوت کے لئے بھی راستے کھول دیئے ہیں۔ تمہیں بھوک لگتی ہے، اس کے لئے راستے متعین کر دیئے، بقاءِ نسل کا جذبہ ہے، اس کے لئے ایک راہ مقرر کر دی۔ بقاءِ حیات کے لئے جن جن چیزوں کی ضرورت ہے وہ مہیا بھی کر دی ہیں اور ان کے حصول کے لئے ضابطے اور قاعدے بھی طے کر دیئے ہیں۔ اب تمہارے کسی بھی عضو سے، تمہارے جوارح سے کوئی بھی حرکت اللہ اور اس کے رسول کے متعین کئے ہوئے راستے اور ان کے بنائے ہوئے سانچے کے خلاف صادر نہ ہو۔ اور اگر ہو گئی تو یہ ایمان کے منافی ہو گی۔ پھر خدا کا ماننا کہاں رہا اور رسول کا ماننا کہاں رہا۔ جو بھی تمہاری حرکت ارادی ہو، وہ اللہ اور اس کے رسول کے مطابق ہونی چاہیئے۔ قدم نہ اٹھے مگر صرف اسی راستے پر جو اللہ اور اس کے رسول کو منظور ہے اور پسند ہے، اس کی طرف سے اجازت ہے۔ ہاتھ کوئی کام نہ کریں، سوائے اس کام کے کہ جس کی اجازت ہے، اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے۔ اور یہاں اللہ اور اس کا رسول Bracketed ہیں۔ بالکل ایک ہیں وہ۔ ایک Antithesis ہیں۔ اس لئے کہ اللہ کی اطاعت درحقیقت رسول ہی کی اطاعت کے واسطے سے ممکن ہے۔ خدا نے ہر ایک کے پاس براہ راست تو اپنی ہدایت نہیں بھیجی۔ لہٰذا یہ دو چیزیں نہیں۔ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ ج فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ

فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۝ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی۔ اور اگر پیٹھ موڑ لوگے، پیٹھ دکھا جاؤ گے، اعراض کروگے تو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ وگے اور ہمارے رسول پر بھی سوائے واضح طور پر پہنچا دینے کے اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ اپنا حشر خود دیکھ لوگے انجام خود دیکھو گے، ہم تو غنی اور حمید ہیں ہی۔ اوپر بیان ہو چکا۔ فَکَفَرُوْا وَتَوَلَّوْا وَّاسْتَغْنَی اللّٰہُ ؕ وَاللّٰہُ غَنِیٌّ حَمِیْدٌ ؕ اور جہاں تک ہمارے رسول کا معاملہ ہے تو فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ ۔ ہمارے رسول پر بھی سوائے پہنچا دینے کے کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ آگے تمہیں جواب دہی کرنی ہوگی۔ اپنے بھلے اور برے، اپنے نفع و نقصان کے تم خود مختار ہو اور خود ہی بھگتو گے صرف تبلیغ و تذکیر ہمارے رسول کی ذمہ داری ہے۔ وہ تم پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی واضح کر چکے ہیں اور اپنے رسول سے کہہ چکے ہیں کہ "فَذَکِّرْ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَکِّرٌ ؕ لَسْتَ عَلَیْھِمْ بِمُصَیْطِرٍ ؕ اِلَّا مَنْ تَوَلّٰی وَکَفَرَ ۝ فَیُعَذِّبُہُ اللّٰہُ الْعَذَابَ الْاَکْبَرَ ۝ اِنَّ اِلَیْنَآ اِیَابَھُمْ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَیْنَا حِسَابَھُمْ ۝ اے نبی! آپ ان کی فکر میں پریشان نہ ہو جئے۔ آپ تو ان کو یاد دہانی کراتے رہیئے۔ چونکہ آپ صرف تذکیر کرنے والے، یاد دہانی کرانے والے اور نصیحت کرنے والے ہیں آپ ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجے گئے۔ ہاں جو روگردانی اور انکار کرے گا تو خدا اس کو (آخرت) میں بڑی سزا دے گا۔ چونکہ چار و ناچار ان کو ہمارے ہی پاس آنا ہوگا۔ پھر ہمارا ہی کام ان سے حساب لینا ہے اور ان کے کئے کی سزا دینا ہے۔ تو ہم سے جو اعمال صادر ہوتے ہیں، ان کے بارے میں ایک چیز تو یہ لازم ہو گئی کہ اطاعتِ الٰہی اور اطاعتِ رسول کا قلادہ گردن پر پڑا رہے۔ اس سے کوئی مفر ممکن نہیں۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہو گیا کہ جو کچھ کروگے اور کرنا چاہو گے ظاہر بات ہے کہ انسان جو حرکت کرتا ہے وہ کسی مقصدِ معیّن کے تحت کرتا ہے۔ اگر بے مقصد کر رہا ہے تو اس کو دیوانگی اور پاگل پن کہا جائے گا۔ ہر حرکت کے پیچھے کوئی نہ کوئی ارادہ ہوتا ہے۔ کچھ نہ کچھ مقاصد (MOTIVES) ہوتے ہیں کسی نہ کسی چیز کے حصول کے لئے ہاتھ حرکت کرتے ہیں، پاؤں حرکت کرتے ہیں تو اس بات میں بھی ایمان کے لازم کے طور پر اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا کہ مجرّد اپنے ارادے اور اپنی قوّت اور کسی بھی مادی ذریعہ اور اسباب و وسائل کے بل پر تم کچھ بھی نہیں کر سکو گے، جب تک خدا نہیں چاہے گا۔ اس کا نام ہے توکّل۔ کبھی بھی یہ فریبِ نفس ہو گیا کہ میں جو چاہوں گا

کروں گا۔ تو یہ ایمان کے منافی ہے۔ وہ شخص محجوب ہے۔ اس وقت جب وہ یہ سمجھ رہا ہے کہ میں اپنے ارادے سے کچھ کرلوں گا۔ اسے پتہ ہی نہیں کہ یہاں ارادہ چلتا ہے صرف خدا کا۔ مشیّت کارفرما ہے، صرف اس کی۔ مجرّد اپنی مشیّت اور اپنے ارادہ سے کچھ نہیں کر سکتے۔ اپنی انگلی تک کو حرکت نہیں دے سکتے۔ اگر یہ خیال ہے کہ میں جب چاہوں اپنی مشیّت سے، اپنے ارادے سے، اپنی قوّت سے اپنے کسی عضو کو حرکت دے سکتا ہوں تو یہی کفر ہے۔ کفر کا اور اسلام کا جو معاملہ ہے، وہ بڑا مختلف ہے۔ ایک درویش نے کہا ہے، بڑے عجیب انداز میں، کہ "جو دَم غافل سو دم کافر" کفر کی ایک یہ تعبیر بھی ہے جو وقت انسان پر غفلت کا گذر گیا، اسے یاد نہ رہا کہ خدا بھی ہے اور میں اس کا بندہ ہوں درحقیقت وہ جو سانس ہے اس کا، وہ ایک حالت کفر میں نکلا۔ توکّل جس چیز کا نام ہے وہ یہ ہے کہ انحصار، دار و مدار، بھروسہ اور تکیہ سوائے خدا کے اور کسی چیز پہ نہ ہو۔ توکّل اسباب اور ذرائع و وسائل سے مستغنی ہو جانے کا نام نہیں۔

اسباب سب فراہم کرو، جو قاعدے اور ضابطے ہم نے مقرر کئے ہیں، ان کے مطابق ہر چیز کا اہتمام کرو۔ جیسے کہ حضورؐ نے تعلیم دی کہ "پہلے اونٹ کی نکیل کو باندھو پھر اللہ کے بھروسہ پر چھوڑ دو"، لیکن اگر یہ خیال ہو گیا کہ مجرد ان اسباب و وسائل سے اور جوارح سے کوئی کام ہو جائیگا۔ تو یہ درحقیقت اس ایمان کے منافی ہوگا اس مفہوم کو ذہن میں رکھئے اور پھر اس آیت کا مطالعہ کیجئے۔ اَللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ ط وَعَلَی اللّٰہِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ اللہ ہی ہے حقیقی مالک و معبود۔ اس کے سوا کوئی معبود اور مالک و آقا نہیں۔ یہاں اِلٰہ کا جو پہلو خاص طور پر پیش نظر رکھنا چاہیئے وہ یہ کہ اس کے سوا یہاں کسی کی مشیّت کارفرما نہیں۔ اگر دو مشیّتیں ہو گئیں تو یہی شرک ہوگا۔ میں نے آپ کو بتایا تھا، جب میں سورۂ لقمان کے دوسرے رکوع کے درس کے ضمن میں شرک کی توضیح کر رہا تھا کہ حضور اکرمؐ نے اسی لئے ٹوک دیا تھا، جب ایک شخص نے کہا تھا۔ "مَا شَآءَ اللّٰہُ وَمَا شِئْتَ" جو خدا چاہے اور آپ چاہیں۔ آپؐ نے فوراً روک دیا اور فرمادیا۔ اَجعلتنی لِلّٰہِ نِدًّا۔ کیا تو نے مجھے خدا کا مدّ مقابل بنا دیا؟ یہاں مشیت صرف ایک کارفرما ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا یہ جملہ ہے، ان نصیحتوں میں جو انہوں نے بوقتِ رحلت اپنے بیٹے کو کی ہیں کہ "اے میرے بیٹے اس بات کو

جان لے کہ لَا فَاعِلَ فِی الْحَقِیْقَۃِ وَ لَا مُؤَثِّرَ اِلَّا اللّٰہُ "اللہ کے سوا فی الواقع فاعل اور مؤثر اور کوئی نہیں" کسی چیز میں بھی کوئی تاثیر آزادانہ نہیں ہے۔ ہر تاثیر کا ظہور اذنِ رب کے تحت ہوتا ہے۔ آگ نہیں جلا سکتی جب تک کہ اللہ کا حکم نہ ہو۔ پانی تمہاری پیاس کو نہیں بجھا سکتا۔ جب تک کہ اذنِ رب نہ ہو۔ ہر لقمہ جو تمہارے حلق سے نیچے اترتا ہے، اذن رب کا طالب ہوتا ہے کہ میں اس کے حق میں غذا کا کام کروں یا زہر کا کام کروں۔ کسی چیز کی ذاتی تاثیر نہیں ہے اور کوئی چیز، نتیجہ خیز اور بارآور نہیں ہو سکتی جب تک کہ خدا نہ چاہے۔ یہی سبق دیا گیا ہے غزوہ حنین کے موقع پر۔ "وَ یَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ۔ وہ حنین کا واقعہ یاد کرو جب تم بڑی کثیر تعداد میں تھے اور تم سوچتے تھے کہ جب ہم تین سو تیرہ ہوتے تھے تو جب کوئی ہمارا راستہ نہ روک سکا۔ تو آج تو ہم ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ بارہ، تیرہ ہزار کا لشکر اور بعض روایتوں میں تیس ہزار تک کا لشکر آتا ہے کہ اس وقت حضورؐ کے ساتھ اور ہمرکاب اتنی بڑی تعداد ـــــ تو بعض مسلمانوں کو خیال ہو گیا کہ اب کون آئے گا ہمارے مقابلے پر۔ پس پہلے ہی ہلّے میں تیر اندازوں کے تیروں کی جو بوچھاڑ آئی ہے تو وہ بھگدڑ مچی ہے کہ روایات کے اندر آتا ہے کہ چند جان نثار صحابہ کرامؓ ساتھ رہ گئے تھے اور مجبوراً خود حضورؐ کو سواری سے اترنا پڑا۔ جھنڈا اپنے ہاتھ میں تھاما اور خود رجز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے "اَنَا النبی لا کذب۔ انا ابن المطلب۔ کس لئے؟ وَ یَوْمَ حُنَیْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْکُمْ کَثْرَتُکُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْکُمْ شَیْئًا وَّ ضَاقَتْ عَلَیْکُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ" تمہاری کثرت کام آئی؟ تعداد کام آئی؟ زمین اس روز تنگ نظر آنے لگی۔ یہ سبق اس لئے سکھایا گیا کہ کبھی بھی تمہارا توکل، تمہارا انحصار، تمہارا تکیہ اور تمہارا بھروسہ اسباب اور وسائل پر نہ ہو۔ یہی وہ معاملہ ہے کہ جس پر ایک مرتبہ خود حضورؐ کو ٹوک دیا گیا تھا۔ لوگوں نے حضورؐ سے اصحابِ کہف، ذوالقرنین اور روح کے متعلق سوال کئے۔ حضورؐ نے فرمایا: کل جواب دے دوں گا۔ ان شاء اللہ نہیں کہا۔ استثناء نہیں کیا۔ اب وحی نہیں آ رہی، حضرت جبرئیل تشریف نہیں لا رہے۔ پوزیشن کتنی Critical اور نازک ہو گئی، یہ بھی ذرا سوچئے کہ وہ سوال کرنے والے روز آ کر کس طرح پریشان کرتے ہوں گے۔ جب جواب لے کر حضرت جبرئیل اترے ہیں تو اس میں یہ ہدایت بھی

اتری ہے کہ وَلَا تَقُولَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ کسی کام کے بارے میں کبھی نہ کہنا کہ میں یہ کام کل کروں گا مگر یہ کہ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ اس قید کے ساتھ کہہ سکتے ہو، علی الاطلاق نہیں کہہ سکتے۔ عام آدمی کہے تو کوئی بات نہیں، بعض چیزیں عوام کے لئے ٹھیک ہیں۔ ان کی ذہنی سطح کے مطابق ان سے معاملہ ہوگا۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط لیکن "حسناتُ الابرار سیّئاتُ المقرّبین" کے لئے درست نہیں۔ ایک ہی چیز ہے لیکن ایک سطح (Level) پر اس کا حکم اور ہے، دوسری سطح پر حکم بدل جاتا ہے۔ کسی مردِ عارف کی زبان پر یہ کلمہ اگر اس طرح آجائے کہ اس میں استثناء نہ ہو، قید نہ ہو۔ تو یہ اس کے لئے ہرگز نہیں۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط وَعَلَى اللّٰهِ فَلْیَتَوَکَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ط یہاں ایک اعتبار سے ایمان کے ثمرات و نتائج کا بیان مکمل ہوگیا

(جاری ہے)

مولانا محمد سعید الرحمٰن علوی

جدید تعلیم اور علمأ کا موقف

سرسید احمد خان کی فکر اختلاف کے باوجود اپنے یہاں جدید تعلیم کا نظم ضروری تھا

ملک کے معروف قومی اخبار "نوائے وقت" کے لاہور ایڈیشن کی ۱۴/ اپریل کی اشاعت میں معروف کالم نگار میاں عبدالرشید نے "علی گڑھ اور دیوبند" کے عنوان سے اپنا کالم لکھا۔ اس کالم میں ان دونوں تعلیمی تحریکوں کے سرخیل مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمہ اللہ تعالےٰ اور سرسید احمد خان مرحوم کے متعلق یہ لکھا گیا کہ:

> "دلچسپ بات یہ ہے کہ تحریکِ علی گڑھ کے بانی سرسید احمد خان اور مکتب دیوبند کے بانی اور (صحیح طور پر اس تحریک علمی کے بانی) مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، دونوں مولانا مملوک علی کے شاگرد تھے۔ مولانا موصوف، مولوی رشید الدین دہلوی کے تربیت یافتہ تھے جنھوں نے شاہ ولی اللہ کے صاحبزادے اور جانشین شاہ عبدالعزیزؒ سے علمی فیض حاصل کیا تھا۔ گویا یہ دونوں تحریکیں ولی اللّٰہی سرچشمہ سے فیض یافتہ تھیں۔"

معزز نامہ نگار نے یہ بات بالکل صحیح لکھی۔ اسی طرح ان کا یہ فرمان بھی وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو صحیح ہے کہ علی گڑھ تحریک نے شاہ ولی اللہؒ کے اس کام کو اپنے ہاتھ میں لیا جس کا تعلق شریعت محمدی کو دلائل و براہین کے ساتھ پیش کرنے اور مسلمانوں کی اقتصادی بدحالی دور کرنے سے تھا اور تحریک دیوبند نے ان کے کام کا وہ حصہ سنبھالا جس کا تعلق مختلف اسلامی فرقوں میں مفاہمت پیدا کر کے اسلامی معاشرہ کو نقصان دہ رسوم سے پاک و صاف کرنے اور روحانیت اور شریعت کو ساتھ ساتھ رکھنے سے تھا۔

لیکن ان کے کالم کا وہ حصہ صحیح نہیں جس میں انھوں نے تحریک دیوبند کے متعلق لکھا: "ایک طبقہ جس میں زیادہ تر علماء تھے، انگریزی حکومت کے مسلمانوں پر مظالم اور عیسائی مشنریوں کے اسلام پر سوقیانہ حملوں کے باعث یورپی تہذیب ہی سے متنفر ہوگیا۔ انھوں نے انگریزی پڑھنے اور مغربی سائنسی علوم سیکھنے کی سخت مخالفت کی۔ غالباً انگریز دشمنی ہی کے زیر اثر انھوں نے سیاسی جدوجہد میں ہندو کا ساتھ دیا اور اس سے مل کر یورپ کے تصور وطنیت کو اپنا لیا۔ ان میں علمأ دیوبند پیش پیش تھے۔"

جہاں تک انگریز دشمنی کے ردِ عمل میں یورپی تہذیب سے متنفر ہونے کا سوال ہے، وہ بات اس لیے غلط

ہے کہ اسلام جس کے ہم سب نام لیوا ہیں اس کی اپنی ایک تہذیب ہے، اور ایک مسلمان جس طرح اعتقادات و عبادات میں اسلام ہی کے موقف و نقطہ نظر کا پابند ہے، اسی طرح وہ تہذیب حتیٰ کہ معاشرت، معاش اور سیاست بھی چیزوں میں اسے اسلام کا پابند ہونا ضروری ہے، علما کا تنفر کسی ردِّ عمل کا نتیجہ نہ تھا بلکہ وہ اسلام کا تقاضا تھا جس پر وہ انگریزی راج سے قبل بھی عمل پیرا تھے۔ بعد میں بھی عمل پیرا رہے اور یہ تنفر صرف یورپی تہذیب سے نہیں بلکہ ہر تہذیب سے تھا، حتیٰ کہ اس خطّہ کی اکثریتی قوم "ھندو" جس کے ساتھ تعاون و اشتراک کا طعنہ علما کو شدومد سے دیا جاتا ہے اور اسی کالم میں بھی دیا گیا۔ اس کی تہذیب سے بھی علما کے تنفر کا یہی عالم تھا اور آزادی کی جنگ میں اتنے قرب و تعلق کے باوصف انھوں نے کبھی اپنی تہذیبی میراث کی قربانی نہیں دی۔

سیاسی جدوجہد میں ہندو کا ساتھ دینے اور اس سے مل کر یورپ کے تصورِ وطنیت کو اپنا لینے کا جہاں تک تعلق ہے وہ بھی حقائق کی صحیح تعبیر نہیں۔ اس معاملہ میں علامہ اقبال مرحوم اور مولانا سید حسین احمد مدنی رحمہ اللہ تعالیٰ کی باہمی خط و کتابت قابل دید و ملاحظہ ہے۔ افسوس کہ ہمارے اکثر اقبالی حضرات اس کا لحاظ نہیں کرتے۔ تاہم "حکمتِ قرآن" کے صفحات اس بحث کے متحمل نہیں۔ اس لیے اس بحث کو چھیڑے بغیر ہم اس نقطہ کی طرف آتے ہیں جس پر ہمیں اس وقت گفتگو کرنا ہے اور وہ نقطہ ہے "جدید تعلیم" کے معاملہ میں علماء کے رویے اور ان کے موقف کا۔

نوائے وقت کے کالم نگار نے جو بات آج لکھی ہے کہ:۔

"انھوں نے انگریزی پڑھنے اور مغربی سائنسی علوم سیکھنے کی سخت مخالفت کی"

یہی بات بہت عرصہ پہلے سے کہی جا رہی ہے لیکن افسوس کہ کہنے والوں کے پاس اس کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں۔ پچھلے ایک صدی کے لگ بھگ لٹریچر کا جو حصہ ہماری نظر سے گزرا ہے علما کی جماعت کے ایک ہی ایسے فرد نظر آئے جنھوں نے انگریزی تعلیم کی سخت اور کھل کر مخالفت کی اور وہ ہیں مولانا احمد رضا خاں بریلوی جو ۱۹۲۱ء میں اس دنیا سے رخصت ہوئے۔ ان کے نام و نسبت سے آج ایک باقاعدہ تحریک موجود ہے۔ موصوف نے فتوے کے میدان میں سخت لب و لہجہ اختیار کیا اور قریب العہد ہم عصر شخصیات اور جماعتوں میں سے کسی کو معاف نہیں کیا۔ ادھر انھوں نے "اعلام الاعلام بان ھندوستان دار الاسلام" نامی رسالہ ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۸-۹ء میں سپرد قلم کیا جس کا موضوع اپنے نام سے ظاہر ہے۔ اس رسالہ کے سرورق پر یہ عبارت ہے:۔

"اس میں اس امر کی تحقیق کہ ہندوستان دار الاسلام ہے۔"

ان کے علاوہ کسی ذمہ دار عالم دین بالخصوص تحریک دیوبند سے وابستہ علماء میں سے کسی نے بھی تو ایسی بات نہیں کہی۔ بلکہ اس تعلیمی تحریک کے سرخیل اعظم حضرت الامام شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ کے خلف الرشید

شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ تعالےٰ کا فتوےٰ جس میں انگریزی زبان کی تعلیم وتعلم کو درست قرار دیا گیا ہے۔ خود سرسید احمد خان مرحوم نے اپنے رسالہ" اسباب بغاوت ہند" میں نقل کیا ہے۔

ان کے علاوہ افتا کے اعتبار سے اس حلقے کے سب سے مؤثر اور ذمہ دار بزرگ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے جب یہ سوال ہوا کہ " انگریزی پڑھنا پڑھانا درست ہے یا نہیں ؟"

تو مولانا نے جواب میں فرمایا :" انگریزی زبان سیکھنا درست ہے بشرطیکہ کوئی معصیت کا مرتکب نہ ہو اور کوئی نقصان دین (کا) اس سے نہ آئے "۔(تفصیل فتاوےٰ رشیدیہ میں ملاحظہ فرمائیں ۔)

مولانا عبدالحی لکھنوی رحمہ اللہ تعالےٰ کا فتوےٰ " مجموعۃ الفتاوےٰ ج۱، ص۱۱ میں جس میں حضور علیہ السلام کے اس حکم کا حوالہ دے کر جس میں آپ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو یہود کا خط سیکھنے کا کہا تھا" انگریزی زبان سیکھنے کو جائز قرار دیا۔

اسی طرح مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ تعالےٰ کا فتوےٰ فتاوےٰ امدادیہ جلد ۴ ص۱۹۰ ، ص۱۹۱ میں ہے اس میں آپ نے ایک تو اس آیت قرآنی کا حوالہ دیا جس میں اللہ تعالےٰ نے رنگتوں اور زبانوں کے اختلاف کو اپنی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیا (سورۃ ۔ روم) دوسرے وہی زید بن ثابت رضی اللہ تعالےٰ عنہ کو دیے گئے حکم نبوی کا ذکر کیا تیسرے اس بات کا ذکر کیا کہ اس زمانہ میں فارسی آتش پرستوں کی زبان تھی لیکن حضور علیہ السلام کا اس کے ذریعے تکلم کرنا ثابت ہے (ابن ماجہ) اور پھر آخر میں لکھا۔

" سو اگر کوئی ایسا شخص جو اپنی ضروریات دینیہ، عقائد و مسائل سے واقف ہو اور ظن غالب ہو کہ یہ شخص بوجہ صحبت کفار و فجار کے ان کے خیالات یا رسوم یا وضع کی طرف مائل اور اپنے دین سے سُست عقیدہ نہ ہوگا واسطے کسب معاش وغیرہ کے انگریزی یا ہندی پڑھے جائز ہے۔"

اور تحریک دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور اس تحریک کے ایک اہم ستون مولانا سید محمد انور شاہ کے اس سلسلہ کے خیالات سوانح قاسمی اور انوار الباری میں دیکھے جا سکتے ہیں جنھیں مرتب کیا مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ اور مولانا سید احمد رضا بجنوری نے۔

بلکہ ہم آپ کے سامنے ایک حوالہ اور پیش کرتے ہیں جو چھپا مولانا مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن کی جلد نمبر۱۱ عدد نمبر۳ ص۲۲۱ ، ص۲۲۲ پر اور لکھنے والے ہیں چودھری غلام احمد صاحب پرویز جو آخر وقت تک مولوی دشمن بالخصوص دیوبندی علما کی دشمنی میں سرگرم عمل رہے۔ موصوف حکومت برطانیہ کے غالباً ہوم ڈیپارٹمنٹ میں ملازم تھے۔ لکھنے لکھانے کا مشغلہ ساتھ تھا۔" طلوعِ اسلام" تو اپنا رسالہ تھا لیکن اس سے قبل مختلف رسائل میں اپنے مضامین چھپواتے۔ کبھی اصلی نام سے کبھی قلمی ناموں سے۔" متاعِ کارواں" کے عنوان سے ترجمان القرآن بابت ماہ رمضان ۱۳۵۶ھ

کا ان کا یہ مضمون ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کے حقیقی اسباب پر گفتگو کی اور ثابت کیا کہ اس مصیبت عظمیٰ کا باعث سرکار برطانیہ کی ایک منظم اسکیم تھی اس کی تفصیل بھی انھوں نے دی جس کے دہرانے کا موقع نہیں۔ اور پھر لکھا:۔

"الزام دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کے ملّانوں نے انھیں انگریزی پڑھنے سے روکے رکھا۔ اس لیے یہ قوم تعلیم میں پیچھے رہ گئی لیکن مذکورہ صدر واقعات کو سامنے رکھیے اور پھر فیصلہ کیجیے کہ مسلمانوں کو تعلیم سے روکنے والے ان کے ملّانے تھے یا ایک منظم اسکیم تھی؟ ملّانے جو یوں بدنام کیے جاتے ہیں ان کی تو یہ حالت تھی کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمہ اللہ تعالےٰ نے فتوےٰ دیا تھا کہ انگریزی پڑھنا، علوم جدیدہ کا حاصل کرنا، اسلام کی روایات اور روح کے بالکل مطابق ہے علماء حضرات کو تو مفت میں مورد الزام ٹھہرایا جاتا ہے۔"

کتنی زبردست شہادت ہے مولوی ملّانے کی نہیں خالص تعلیم یافتہ بزرگ کی جو سرسید احمد خان مرحوم کی تعلیمی اسکیم کے ہی علمبردار نہ تھے بلکہ ان کے فکری اور اعتقادی ورثے کو بھی بڑھانے اور چلانے والے تھے میاں عبدالرشید صاحب اور ان جیسے بہت سے حضرات کے شاید اس معاملہ میں وہ استاذ تھے کہ ان لوگوں نے ہندو سے گٹھ جوڑ کر لیا تھا خیر اس بحث کو چھوڑیے اور نظر اس پر رکھیے کہ تعلیم کے معاملہ میں مولوی کے سر پتھوپے جانے والے جرم کی صفائی پرویز صاحب دے رہے ہیں اور وجہ اس کی ظاہر ہے کہ مولوی نے یہ جرم کیا نہیں۔ حقائق اور واقعاتی شہادتیں اس کے خلاف ہیں۔

علماء کے ان فتاوےٰ اور پرویز صاحب کے اس نوٹ کے بعد مزید ضرورت تو نہیں رہتی لیکن ہم ذرا اس بات کا جائزہ لینا ضروری سمجھتے ہیں کہ سرسید احمد خان مرحوم اور علماء صادقین کے درمیان اختلاف کی نوعیت کیا تھی؟

اس میں شک نہیں کہ سرسید احمد خاں مرحوم بھی شاگرد تھے مولانا مملوک علی رحمہ اللہ تعالےٰ کے اور ابتداً میں ان کے عمومی خیالات ویسے ہی تھے جیسے عام ہندوستانی اہل علم کے جس پر سب سے بڑی سند ان کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" ہے لیکن اس کے بعد ان کی قلب ماہیت ہوئی۔ اس سوال پر بحث نہیں کرنا چاہتا کہ کیوں ہوئی لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہوئی اور اس کی متعدد موثق شہادتوں میں ایک اہم ترین شہادت ان کی کتاب سرکشی بجنور ہے جس میں مرحوم نے ہر آزادی خواہ اور فدائے ملک و ملت کو بری طرح لتاڑا۔

ادھر مولانا محمد قاسم نانوتوی اور سرسید کے مابین ہونے والی خط و کتابت ملاحظہ فرمالیں جو "تصفیۃ العقائد" کے عنوان سے شائع شدہ موجود ہے۔ اس سے اندازہ کرنا آسان ہوگا کہ سید صاحب موصوف کی کج فکری پر علماء

نے اصلاحی مضامین وجواب لکھے جنھیں ان کی تعلیمی تحریک پر کوئی تنقید یا تنکیر نہ تھی تعلیمی تحریک کے سلسلہ میں اگر علمائے گستاخی کی تو صرف اس قدر کہ ان سے یہ عرض کیا کہ اس میں ذرا دینی اور مذہبی تعلیم کا بھی اہتمام کر لیا جائے لیکن وہ برہم ہوتے اتنے کہ الامان۔

"تہذیب الاخلاق" کے حوالے سے دو عبارتیں ملاحظہ فرمالیں اور علماء پہ بدزبانی اور سخت زبانی کا الزام دینے والے اس مقدس زبان پر بھی ذرا نظر رکھیں۔

"بڑے بڑے معمم (عمامہ والے) اور مشمشل (شملہ والے) قدوسی عالموں نے بہت غور کے بعد یہ تجویز کی کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے اور کتب درسیہ، عقائد اور فقہ واصول وتفسیر وحدیث وعلم کلام بھی انگریزی کے ساتھ پڑھائے جائیں تاکہ عقائد مذہبی پختہ و درست رہیں مگر میں یہ عرض کرتا ہوں کہ مقلدانہ تعلیم مذہبی اصول حقہ واقعیہ پر بلاشبہ مانع نقصان عقائد حقہ اسلامیہ کے ہوگی مگر تقصیر معاف ہو اندھی تقلیدی تعلیم مذہبی تو مانع نقصان عقائد نہیں ہوسکتی۔ اور یہ کتب درسیہ مذہبیہ تو لامذہبی کا علاج کر نہیں سکتیں بلکہ اگر یہ کتابیں انگریزی تعلیم اور مغربی علوم کے ساتھ پڑھائی جاویں گی تو اور زیادہ لامذہبی اور بداعتقادی پھیلے گی۔"

(بحوالہ روشن مستقبل ص۲۰۳ مطبوعہ نظامی پریس بدایوں)

دوسری جگہ اس طرح لتاڑا اور پچھاڑا کہ:۔

"اس زمانہ میں پرانے طریقے پر مسلمانوں نے کئی مدرسے تعلیم کے لیے جونپور، علی گڑھ، کانپور، سہارنپور، دیوبند، دہلی، لاہور میں جاری کیے ہیں۔ مگر میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں۔ قدیم کتابیں ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی کی تعلیم نہیں کرتیں۔ برخلاف اس کے جھوٹی تعریف کرنا اور زندگی کو غلامی کی حالت میں رکھنا اور تکبر اور غرور کو خود پسندی کا منبع بنانا اور اپنے ابنائے جنس سے نفرت کرنا اور ہمدردی نہ رکھنا سکھاتی ہیں۔ (تہذیب الاخلاق ج ۲ ص ۹۶ ۴)

گویا موصوف کے نزدیک قدیم کتب درسیہ جن میں تفسیر وحدیث سبھی شامل ہیں وہ لامذہبیت اور بداعتقادی کا باعث ہیں اور ان کی تعلیم کے لیے جو مدرسے قائم ہوئے جنھیں بوریہ نشین علمائے خون جگر سے سینچا اور غریب مسلمانوں نے برائے نام چندوں سے اعانت کی لیکن بڑے اخلاص کے ساتھ، وہ بے فائدہ اور لغو ہیں۔ قدیم کتابیں نہ آزادی کا سبق پڑھاتی ہیں نہ راستی وسچائی کا اور نہ صفائی کا۔

اس تفصیل کے بعد کسی ذی شعور پر یہ بات مخفی نہیں رہتی کہ سرسید احمد خاں کیا چاہتے اور وہ قوم کو کس طرف

لے جانا پسند کرتے تھے؟ اس پر بھی کسی کی تسلی نہیں ہوتی تو ہم توجہ دلائیں گے لارڈ میکالے کی تعلیمی اسکیم کی طرف جو ۱۸۳۵ء میں (یعنی انقلاب ۱۸۵۷ء سے ۲۲ برس قبل) ایک رپورٹ کی شکل میں سامنے آئی جس میں ہندوستان کے ہر باشندے کے ذہن وفکر کو بدل کر انگریز ہی بنانا مقصود تھا۔ (ملاحظہ فرمائیں تاریخ تعلیم ص۸۷ مطبوعہ کراچی) اور پھر تہذیب الاخلاق جلد دوم کا پہلا صفحہ ملاحظہ فرمائیں۔ جناب سید فرماتے ہیں:۔

"ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ سویلزیشن یعنی تہذیب (کونسی تہذیب؟) اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو اور وہ بھی دنیا میں معزز ومہذب کہلائیں۔"

لارڈ میکالے کی پوری بات ہم نے طوالت کے خوف سے نقل نہیں کی اس کا خلاصہ نقل کر دیا۔ سید صاحب کا ارشاد لفظاً نقل کر دیا۔ دونوں کی لے ملاحظہ فرمالیں۔ سید صاحب کے متعلق کہنا پڑ گیا کہ انہی کی بات اپنی زبان میں کہہ رہے ہیں لیکن انداز ایسا ہے کہ مسلمان معزز ومہذب کہلانے کے شوق میں راغب ہو جائیں جناب سید ترکوں پر بڑے خوش ہیں جیسا کہ مولانا طفیل احمد علیگ مرحوم نے ان کا ارشاد نقل کیا۔ اس خوشی کا سبب یہ ہے کہ ترکوں نے معاشرت وہ اپنا لی ہے کہ ان میں اور یورپین حضرات میں فرق محسوس نہیں ہوتا۔

اور یہی وجہ ہے کہ سرسید احمد خاں صاحب کے سوانح نگار مولانا حالی مرحوم نے انھیں "اصلاح مذہبی کا بیڑہ اٹھانے والا" لکھا کیونکہ حالی مرحوم کے الفاظ میں "مسلمانوں کا اعتبار حکمران قوم کی نظر میں روز بروز کم ہو رہا تھا" اس لیے اصلاح مذہبی کی ضرورت تھی اور اصلاح مذہبی ایسے ہی ممکن تھی کہ دین حق میں "ترمیم وتحریف" کا دروازہ کھول کر ایسی روش اختیار کی جائے کہ حکمران قوم خوش ہو جائے۔

یہ ہے تعلیمی تحریک کا اصل پس منظر جس کی بنیاد پر مغرب علمائے جناب سرسید احمد خاں صاحب کے رویہ سے اختلاف کیا ورنہ نفس تعلیم انگریزی سے اختلاف کی نہ کوئی وجہ تھی اور نہ ایسا ممکن تھا اور نہ علمائے ایسا کیا۔ ہم ان کے فتووں کے ساتھ ساتھ پرویز صاحب کا حوالہ نقل کر چکے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس میدان میں قوم کی پسماندگی کا سبب انگریزی پالیسی تھی نہ کہ ملانوں کا طرز عمل۔ علماء بے چاروں کی مجبوری یہ ہے کہ انھیں "ٹریفک کے سپاہی" کے طور پر اپنا فرض ادا کرنا ہوتا ہے چاہے اس کی زد میں کوئی آئے؟

جمعیۃ علمائے ہند جس کے سیاسی رویہ پر ہمارے اہل دانش اکثر ناراض رہتے ہیں اور اسے ہندوؤں کا ایجنٹ تک کہہ دیتے ہیں؛ اس نے اپنے اجلاس مارچ ۱۹۳۸ء میں وارد ھا تعلیمی اسکیم تک کو معاف نہ کیا۔ انھوں نے اس تعلیمی اسکیم پر غور کرنے کی غرض سے ایک سب کمیٹی بنائی۔ اس نے غور کیا اور کامل غور کیا۔ پھر رپورٹ دی۔

وارد ھا تعلیمی اسکیم میں ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم کا اہم رول تھا۔ ڈاکٹر صاحب فداترس، نیک نفس اور ہر اعتبار سے لائق تعریف تھے علماً کے حلقوں میں ان کا احترام تھا اور وسیع تعلقات تھے۔ لیکن جب مرحوم حالات کی کشاکش کے سبب غلطی کا شکار ہوئے اور انھوں نے ایک دفعہ اس طرح کی لکھ ڈالی کہ:

"بچوں کے ذہن میں ابتداہی سے رواداری اور روشن خیالی پیدا کرنے کے ذرائع اختیار کرنا اور ان کو تعلیم سے فراغت کے بعد ایک مفید شہری اور کارگزار ان بنانا"

تو جمعیت کے مظلوم اور معتوب مولویوں نے ٹوکا اور سختی کے ساتھ اپنی رپورٹ میں کہا کہ:

"ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہو، نظری تعلیم کے ساتھ بنیادی دستکاری کی تعلیم اور ابتدائی تعلیم کا عام ہونا سب باتیں صحیح و درست لیکن یہ چوتھا نقطہ اس بات کی چغلی کھاتا ہے کہ ایک ہی تہذیب اور ایک ہی قسم کے عقائد اور مشابہ اعمال کی پابندی ہو جائے۔ نیز یہ کہ اس میں ان باتوں کی اصلاح ضروری ہے کہ تعلیم مخلوط نہ ہو، مسلمان بچوں کو گانے بجانے کی تعلیم نہ دی جائے، تصویر کشی جیسے فنون انھیں نہ سکھائے جائیں اور جو مسلم بچے حفظ قرآن وغیرہ میں مشغول ہوں انھیں جبری تعلیم سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔"

علماً نے کانگریس سے اپنے تعلقات وغیرہ کسی چیز کا خیال نہ کرکے وہ بات کہی جو انھیں کہنی چاہیے تھی۔ اس پر انھیں تنگ نظر اور نہ معلوم کیا کیا کہا گیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح سرسید کی تعلیمی اسکیم کے سلسلہ میں ہوا۔ علماً کو انگریزی پڑھنے پڑھانے سے اختلاف نہ تھا۔ انھیں اختلاف تھا تو اس سے کہ اس آڑ میں انھیں "انگریز" نہ بنایا جائے۔

باقی وہ ادارے جنھیں سرسید احمد خان صاحب لغو قرار دیتے وہ ایک دانش ور کے قول میں "اسلامی شریعت و تہذیب کے قلعے" ہیں۔ انھوں نے لکھا:

"اگر کہیں برائے نام اسلامی سلطنت ہے بھی تو بھی ایسے اداروں کی ضرورت ہے تاکہ حکومت کو اپنے ذمہ دارانہ عہدوں کے لیے دین دار، امین اور مسلمانوں کی ضرورت سمجھنے والے کارکن مل سکیں لیکن اگر کسی ملک میں قسمتی سے اسلامی حکومت نہ ہو تو وہاں ایسے اداروں کی ضرورت شدید تر ہو جاتی ہے۔ اگر کوئی جماعت کسی صحیح اسلامی حکومت کی کچھ نہ کچھ قائم مقامی کر سکتی ہے اور حفاظت دینی کا فرض انجام دے سکتی ہے تو وہ صرف جماعت علماً ہے۔ اسی نکتہ کے سبب زوال حکومت کے وقت حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے خاندان نے اسلامی تعلیم اور دینی درس و تدریس کا وہ نظام قائم کیا جس نے بڑی حد تک ایک اچھی اسلامی ریاست کی دینی ضرورتیں پوری کیں۔"

اس تفصیل کے بعد اگر کوئی سوال کرتا ہے کہ اگر علماء نے سرسید احمد خان کی تعلیمی اسکیم کی مخالفت نہیں کی، انگریزی پڑھنے پڑھانے سے نہیں روکا اور یہ سب باتیں صحیح ہیں تو پھر مسلمان اس میدان میں کیوں پیچھے رہ گئے۔ گو اس مضمون کے حوالے سے ہم پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی کہ ہم اس سوال کا جواب دیں لیکن ہم مختصراً اس پر گفتگو کرنے میں حرج نہیں سمجھتے۔

یہ بات تو حقیقت ہے کہ انگریزی عمل داری سے قبل (چاہے وہ کمپنی کی شکل میں ہو چاہے بالکلیہ حکومت کی صورت میں) مسلمانوں کا تعلیمی سسٹم عجیب و غریب تھا اور گویا ہر طرف علم کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ مولانا سید حسین احمد مدنی کی نگرانی میں بعض اہل علم و دانش نے تعلیمی ہند کے نام سے ایک عجیب و غریب مجموعہ مرتب کیا۔ جس میں مسلمانوں کی ابتداء سے اپنے وقت تک اس خطہ میں ان کی تعلیمی کیفیت کا بڑا مختصر لیکن جامع تذکرہ تھا۔ اس میں بعض ذمہ دار انگریزوں کی شہادتیں درج تھیں کہ یہاں مسلمان کس طرح خدمت علم میں مشغول تھے۔ "جان بیٹے" کے بقول "ہندوستان پر انگریزوں نے قبضہ جمایا تو اس وقت قومی تعلیم کا سلسلہ بہت کافی طور سے موجود تھا" پروفیسر ماکس میلر کے بقول آبادی کے ۴۰۰ افراد کیلئے ایک درسگاہ "موجود تھی اور ۱۸۲۰ء کی سرکاری رپورٹ کے مطابق ۳۱ لڑکوں کے لیے ایک درس گاہ تھی۔ لیکن یہ سب سسٹم بدلا اور اس طرح کہ یہاں اُلّو بولنے لگے اور یہ سب منظم پلاننگ اور اسکیم تھی سرکار برطانیہ اور اس کے کارندوں کی۔ انگریز کا ذہن ڈیوک آف ڈیون شائر کے بقول یہ تھا کہ:۔

"یہ غیر دانشمندانہ فعل ہے کہ ہندوستانی زیور تعلیم سے آراستہ کیے جائیں۔ جدید تہذیب، جدید ترقی اور جدید علم و ادب سے انہیں سیراب کیا جائے"

جسٹس سید محمود اپنی کتاب تاریخ التعلیم میں کہتے ہیں کہ:۔

"انگریز بہادر تجارت اور دیگر ذرائع سے ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ مالی نفع حاصل کرتے لیکن اہل ہند کو تعلیم دینا وہ اپنا فرض نہ سمجھتے۔ (ص۲)

اس قوم کو جاہل رکھنا۔ اس کے علم کے سوتے خشک کرنا اور اس کی پہلے سے قائم درس گاہوں کی خانہ ویرانی انگریز کی بنیادی پالیسی تھی۔ کیوں؟ اس کا اندازہ اور جواب "امکنس سمنڈے" کی تحریر سے لگا۔

"جب کوئی قوم یا ملک غلام بنایا جاتا ہے تو فاتح سب سے پہلے یہ کام کرتا ہے کہ تعلیم کو تباہ کر دیتا ہے یا بہت بری طرح سے انتظام کرتا ہے چوں کہ علم اور غلامی ساتھ ساتھ نہیں رہ سکتیں۔ (تعلیمی ہند ص۲۸)

بعض انگریزوں کی طبیعت میں سلامتی تھی۔ وہ اس بات کو محسوس کرتے تھے اور بڑی شدت کے

ساتھ، مثلاً سر تھامس نے دارلعوام کی تقریر میں کہا:۔

"ہندوستانیوں کو فائدہ کیا دو گے؟ تم نے ان لوگوں کے ملک کو خراب کیا اور انسانوں کو برباد کیا۔ تم نے اپنی ذاتی حفاظت کے لیے ان لوگوں کو دھوکہ، دغا اور جہالت میں مبتلا کر دیا۔" (تعلیمی ہند صہ ۵)

انگریز سمجھتا تھا اور خوب کہ اس نے حکومت و اقتدار مسلمان سے چھینا ہے، اس لیے اسے دبانا ہی ضروری ہے۔ اس لیے اس کے ساتھ تو یہ سلوک ہوا اس کے بالمقابل ہندو کالج اور ایسے ادارے خوب پھلے بلکہ ان پر خصوصی توجہ دی گئی۔ تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ ۱۸۳۱ء سے واضح ہوتا ہے کہ ہندو کالج کی حوصلہ افزائی اس کے خاص مقاصد میں شامل تھا (تاریخ تعلیم از سید محمود صہ ۳۵) اور اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ انگریز کو کوئی ہندو سے پیار تھا بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ ایسے اداروں میں "انجیل مقدس" کی تعلیم خوب خوب رنگ لا رہی ہے اور "مقدس مسیح" کے نام لیوا بڑھ رہے تھے۔

۱۸۵۳ء میں سر فریڈرک نے تسلیم کیا کہ ہندو کالج میں انجیل کی تعلیم اس قدر زیادہ ہے کہ انگلستان تک کے پبلک سکول میں نہیں۔ ۱۸۴۴ء میں واضح کر دیا گیا کہ اب سرکاری ملازمت اسے ملے گی جو انگریزی جانتا ہوگا تو لوگ اس طرف مجبوراً متوجہ ہوئے لیکن ستم یہ تھا کہ تعلیمی ادارے تعلیم کے لیے کم اور اعتقادی ارتداد کے لیے زیادہ تھے۔ وہ فی الحقیقت مقدس باپ کے روپ میں پادریوں جیسی مخلوق کے اڈے تھے۔ سید محمود صاحب نے "تاریخ تعلیم" کے صہ ۶۶، صہ ۶۷ پر اس بات کا رونا رویا اور بتلایا کہ اس پالیسی کے نتیجہ میں لوگ کس قدر عیسائیت کی آغوش میں چلے گئے۔

مسلمان اپنے عقیدہ کے معاملہ میں روز اوّل سے حساس رہا ہے اور اسے یہ بات کسی طور پر گوارا نہ تھی کہ تعلیم کے نام پر اس کی متاعِ ایمان کو لوٹا جائے لیکن انگریز تھا کہ وہ ادھار کھائے بیٹھا تھا۔ وہ انقلاب ۱۸۵۷ء کا اصلی محرک مسلمان کو قرار دیتا جیسا کہ "حکومت خود اختیاری" کے مصنف مولانا طفیل احمد صاحب نے انگریز اہلِ دانش کی تحریروں کا ذکر کیا۔ "ہنری ٹامس" گورنر بنگال کی بات خاص طور پر نقل کی کہ وہ کس طرح مسلمانوں پر برستا ہے۔

"مسلمانوں کی سازش کا نتیجہ غدر ہے۔ یہ خلیفۂ اول سے لے کر اب تک مغرور، ظالم، اور غیر روادار رہے ہیں۔ ان کے سامنے ہمیشہ اسلامی حکومت کا قیام رہا۔ عیسائیت کے ساتھ نفرت ان کی گھٹی میں ہے کسی دوسرے مذہب کی نام لیوا حکومت کے ساتھ ان کا نباہ قرآن کی رو سے ممکن نہیں۔ (صہ ۵۵، صہ ۵۶)

بس اس سبب سے انھیں جاہل رکھنا اور دکھ پہنچانا ضروری ٹھہرایا اور زندگی کے ہر میدان میں ترقی کی راہیں ان پر بند کردی گئیں۔ جو مسلمان بقول سر تھامس عزم صمیم اور ذہنی صلاحیت کے طور پر سب سے فائق تھا اور تعلیم و تعلم میں اپنا جواب نہ رکھتا تھا۔ وہ ڈاکٹر ہنٹر کے بقول اس سطح پر آگیا کہ چپڑاسی، دفتری اور چٹھی رساں جیسی نوکری اس کا مقدر ٹھہری (بحوالہ روشن مستقبل ص۱۵۹) مسلمان اتنے گر گئے کہ سرکاری اور اعلیٰ افسران ان کے وجود کو ہی تسلیم نہ کرتے۔ (ہمارے ہندوستانی مسلمان ص۱۵۸)

اس پس منظر میں تعلیم جدید کو مسلمانوں کی مشکلات کا حل بتانے والے حضرات پر لازم تھا کہ وہ قومی غیرت اور وقار کا لحاظ کرتے ہوئے اس کا اہتمام کرتے۔ انگریزی دروازے پر دریوزہ گری کے بجائے عزم و ہمت سے آگے بڑھتے لیکن انھوں نے کوسا تو غریب ملانوں کو، لغو قرار دیا تو مدارس کو جہالت کی پوٹ بتلایا تو قدیم تعلیمی ذخیروں کو اور بقول حالی "اصلاح مذہب" کا بیڑا اٹھا کر مذہب میں تحریف و ترمیم کی طرح ڈالی اور ساتھ ہی یہ لازمی قرار دیا کہ جو سکول بنے اس میں ایک جنٹل مین یورپین ہیڈ ماسٹر ضرور ہو۔

آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کی رپورٹ ۱۸۸۶ء ملاحظہ فرمائیں کہ سرسید احمد خان ایک یورپین ہیڈ ماسٹر پر کتنا زور دیتے ہیں۔ لیکن مسلمان حکومت چھن جانے کے بعد مذہب کی قربانی دینا گوارا نہ کرتے بالخصوص جب ان کے کان میں یہ آواز پڑی کہ:-

"اللہ نے ہمیں موقع دیا ہے تو تمام ہندوستان کو عیسائی بنانے کے پروگرام پر پوری قوت سے عمل شروع کردینا چاہیے۔" (تقریر مسٹر منگلس)

تو اور زیادہ بدکے مسلمانوں نے اپنے طور پر چھوٹے پیمانے پر اسکولوں کا سلسلہ قائم کیا تو اس پر سید صاحب برہم ہوئے اور سب سے زیادہ اس وجہ سے برہمی ظاہر کی کہ ان میں لائق یورپین ہیڈ ماسٹر نہیں (آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس رپورٹ ۱۸۸۷ء بمقام لکھنؤ) اور دو سال بعد ۱۸۸۹ء میں کہا کہ اگر ہمارے مدرسۃ العلوم (علی گڑھ) کے ہوسٹل میں مسجد کی فاتحہ کی روٹیوں پر پلنے والوں کی طرح کی مخلوق جمع کرنی ہے اور چار پانچ روپیہ ماہوار کے میاں جی کو معلم بنانا ہے تو خدا کرے کہ بھونچال آئے اور یہ مدرسہ زمین میں دھنس جائے۔

(انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲ جولائی ۱۸۸۹ء)

انھیں بس اعلیٰ تعلیم کا جنون تھا جس کے ذریعے راجواڑوں کے شہزادے اور مراعات یافتہ مسٹر بیک جیسے پرنسپلوں کی نگرانی میں "صاحب اور کلرک" بن سکیں اور بس۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہ رویہ درست نہ تھا، انگریز سے مرعوب ہو کر اس کے خیالات کی ترجمانی، اپنے دین میں ترمیم و تحریف، عیسائی مشنوں کے سامنے گھٹنے ٹیکنا اور انگریز پرنسپلوں کی بالادستی کے نتیجہ میں جو برگ و بار سامنے آئے اس کی ایک شہادت تو ڈاکٹر ہنٹر کا

قول ہے جس میں وہ کہتا ہے :-

"ہمارے انگریزی سکولوں میں پڑھا ہوا کوئی نوجوان ہندو یا مسلمان ایسا نہیں جس نے اپنے بزرگوں کے مذہبی عقائد کو غلط سمجھنا نہ سیکھا ہو۔" (مسلمانان ہند ص۱۴۲)

اور ایک شہادت ہے مسلم لیگ کے سرکاری اخبار "منشور" کی اور یہ شہادت وقیع اور اہم اس لیے ہے کہ سرسیدی اسکول نے جو سیاسی شکل اختیار کی اس کا نام مسلم لیگ تھا۔ ۱۹۰۶ء کا شملہ وفد جو سر آغا خان کی قیادت میں وائسرائے سے ملا اور جس کے لیے تحریری یادداشت علی گڑھ کے پرنسپل سٹریچی نے تیار کی اسی نے بعد میں ڈھاکہ میں مسلم لیگ قائم کی اور لوگ اب بھی فخر سے کہتے ہیں کہ علی گڑھ کو پھیلاؤ تو وہ پاکستان بن جائے گا اور پاکستان کو سمیٹو تو وہ علی گڑھ بن جائیگا۔ مسلم لیگ کے دورِ شباب میں "منشور" نے اپنے اداریوں کالموں میں لکھا۔

"گزشتہ تیس برس سے مسلمان بچے بالعموم صرف انگریزی اسکولوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اس دور کے جتنے تعلیم یافتہ ہیں۔ وہ اسلامی کلچر، اخلاق، اور اسلامی تصورات سے بالکل نابلد ہیں۔ (۹ جون ۱۹۳۹ء)

ان گزارشات سے یہ ثابت ہوا کہ علماً جدید علوم اور انگریزی زبان کے دشمن نہ تھے۔ انھیں اختلاف تھا تو میکالے کی اسکیم سے جس کے نتیجہ میں نوجوانانِ وطن کی قلب ماہیت کا خطرہ تھا۔ بدقسمتی سے سرسید احمد خان اس رنگ میں رنگ چکے تھے کہ وہ انگریزی کلچر اور تہذیب و ثقافت میں ہی عافیت خیال کرتے اور ان کے نزدیک مسلمانوں کی نجات اب اسی میں تھی اور اسی پر بس نہیں وہ اصلاح مذہب کے علم بردار بن کر دینی اقدار کا حلیہ بگاڑنے پر لگ گئے۔ سادہ اور سستی تعلیم ان کے نزدیک بے کار اور مہنگی تعلیم سے مسلمان متنفر کہ اس میں تعلیم کم اور عیاشیت زیادہ تھی۔ لیکن سرسید اور ان کے رفقاء اسی پر مصر جس کے برگ و بار مذہب و دین سے بے گانگی کی شکل میں سامنے آئے جس کی ایک شہادت نہیں دو شہادتیں گزریں اور واقعاتی شہادت پاکستان کے ۲۴ سال کے اہل سیاست، بیوروکریٹس اور متمول لوگ ہیں جو خود تو ڈوبے ہیں۔ باقی کا بھی بیڑا غرق کرنے میں معروف ہیں۔ اور ہاں اس شجر تعلیم کے برگ و بار پر دو شہادتیں اور آخر میں ملاحظہ فرمالیں۔

مرحوم سید ابوالاعلیٰ مودودی اور جناب اکبر الہ آبادی کی۔ وہ بہرطور روایتی ملّا نے نہ تھے شاید ان کے بعد کسی کی آنکھ کھلے اور اب بھی کوئی ہوش کے ناخن لے لے۔

سید ابوالاعلیٰ مودودی نے لکھا:-

"یہ زمانہ تھا جب ہماری قوم کے نوجوان انگریزی تعلیم اور فرنگی تہذیب سے استفادہ کرنے کے لیے مدرسوں اور کالجوں میں بھیجے گئے۔ اسلامی تعلیم سے کورے اسلامی تہذیب میں خام، انگریزی حکومت سے مرعوب

فرنگی تہذیب کی شان و شوکت پر فریفتہ پہلے ہی سے تھے۔ اب جو انھوں نے انگریزی مدرسے کی فضا میں قدم رکھا تو اس کا پہلا اثر یہ ہوا کہ ان کی ذہنیت کا سانچہ بدلا اور ان کی طبیعت کا رخ مذہب سے پھر گیا کیونکہ اس آب و ہوا کی اولین تاثیر یہ تھی کہ یورپ کے کسی مصنف یا محقق کے نام سے جو چیز پیش کی جائے اس پر وہ بے تامل آمنا وصدقنا کہیں اور قرآن و حدیث یا ائمہ دین کی طرف سے کوئی بات پیش ہو تو اس پر دلیل کا مطالبہ کریں۔ اس منقلب ذہنیت کے ساتھ انھوں نے جن مغربی علوم کی تعلیم حاصل کی ان کے اصول و فروع اکثر و بیشتر اسلام کے اصول اور جزئیات احکام کے خلاف تھے۔ اسلام میں مذہب کا تصور یہ ہے کہ وہ زندگی کا قانون ہے اور مغرب میں مذہب کا یہ تصور ہے کہ وہ محض ایک شخصی اعتقاد ہے جس کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام میں پہلی چیز ایمان باللہ ہے اور یہاں اللہ کا وجود ہی مسلم نہیں۔ وہاں سارا نظام شریعت وحی و رسالت کے اعتقادات پر قائم ہے اور یہاں وحی کی حقیقت میں ہی شک اور رسالت کے منجانب اللہ ہونے ہی میں شبہ ہے۔ وہاں حیات اخروی کا اعتقاد پوری اسلامی اخلاقیات کا سنگ بنیاد ہے۔ اور یہاں یہ بنیاد خود بے بنیاد نظر آتی ہے۔ وہاں جو عبادات اور اعمال فرض ہیں یہاں وہ محض عہد جاہلیت کی رسوم ہیں جن کا اب کوئی عملی فائدہ نہیں۔ اسی طرح اسلام کے اصول تمدن و تہذیب بھی مغربی تہذیب و تمدن کے اصول سے یکسر مختلف ہیں۔ قانون میں اسلام کا اصل الاصول یہ ہے کہ خدا خود واضع قانون ہے۔ رسول خدا شارح قانون اور انسان صرف متبع قانون مگر یہاں خدا کو وضع قانون کا سرے سے کوئی حق ہی نہیں لیجسلیچر واضع قانون ہے اور قوم لیجسلیچر کو منتخب کرنے والی ہے۔ سیاسیات میں اسلام کا مطمح نظر حکومت الٰہی ہے اور مغرب کا مطمح نظر حکومت قومی اسلام کا رخ (INTERNATIONAL) بین الملیت کی طرف ہے اور مغرب کا کعبہ مقصود (NATIONALISM) ہے معاشیات میں اسلام اکل حلال اور زکوٰۃ و صدقہ پر زور دیتا ہے اور مغرب کا سارا نظام معاشی سود اور منافع پر چل رہا ہے۔ اخلاقیات میں اسلام کے پیش نظر آخرت کی کامیابی ہے اور مغرب کے پیش نظر دنیا کا فائدہ۔ اجتماعی مسائل میں اسلام کا راستہ قریب قریب ہر معاملہ میں مغرب کے راستہ سے مختلف ہے۔ ستر و حجاب، حدود زن و مرد، تعدد ازدواج، قوانین نکاح و طلاق، ضبط ولادت، حقوق ذوی الارحام، حقوق زوجین اور ایسے ہی دوسرے بہت سے معاملات میں ان دونوں کا اختلاف اتنا نمایاں ہے کہ بیان کی حاجت نہیں اور اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ دونوں کے اصول مختلف ہیں۔ ہمارے نوجوانوں نے مرعوب بلکہ غلامانہ ذہنیت اور پھر غیر مکمل اسلامی تعلیم و تربیت کے ساتھ جب ان مغربی علوم کی تحصیل کی اور مغربی تہذیب کے زیر اثر تربیت پائی تو نتیجہ جو کچھ ہونا چاہیے تھا وہی ہوا۔ ان میں تنقید کی صلاحیت پیدا نہیں ہو سکی۔ انھوں نے مغرب سے جو کچھ سیکھا اس کو صحت اور راستی کا معیار سمجھ لیا پھر ناقص علم کے ساتھ اسلام کے اصول و قوانین کو اس معیار پر جانچ کر دیکھا اور جس مسئلہ میں دونوں کے درمیان اختلاف پایا یا اس میں کبھی مغرب کی غلطی محسوس نہ کی بلکہ اسلام کو سراسر غلط سمجھا اور اس کے اصول و قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرنے پر آمادہ ہو گئے۔

جدید تعلیم نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے ہندوستان کے مسلمانوں کو خواہ کتنا ہی فائدہ پہنچایا مگر ان کے مذہب اور ان کی تہذیب کو جو نقصان پہنچایا ہے اس کی تلافی کسی فائدہ سے نہیں ہو سکتی۔ (ترجمان القرآن جلد ۵ عدد ۱)

اور اکبر الہ آبادی کی سن لیں وہ کیا فرماتے ہیں:۔

نظم!

اک مس سیمیں بدن سے کر لیا لندن میں عقد
اس خطا پر سن رہا ہوں طعنہ ہائے دل خراش

کوئی لکھتا ہے کہ بس اس نے بگاڑی نسل قوم
کوئی کہتا ہے کہ یہ ہے بد خصال و بدمعاش

دل میں کچھ انصاف کرتا ہی نہیں کوئی بزرگ
ہو کے اب مجبور خود اس راز کو کرتا ہوں فاش

ہوتی تھی تاکید لندن جاؤ، انگریزی پڑھو
قوم انگلش سے ملو سیکھو وہی وضع و تراش

جگمگاتے ہوٹلوں کا جا کے نظارہ کرو
سوپ و کاری کے مزے لو چھوڑ کر یخنی و آش

لیڈیوں سے مل کے سیکھو ان کے انداز و طریق
ہال میں ناچو کلب میں جا کے کھیلو ان سے تاش!

بادۂ تہذیب یورپ کے چڑھاؤ خم کے خم
ایشیا کے شیشۂ تقوے کو کر دو پاش پاش!

جب عمل اس پر کیا پریوں کا سایہ ہو گیا
جس سے تھا دل کی حرارت کو سراسر انتعاش

سامنے تھیں لیڈیاں زہرہ وش جادو نظر
یاں جوانی کی امنگ اور ان کو عاشق کی تلاش

ان کی چتون سحر آگیں، ان کی باتیں دلربا
چال ان کی فتنہ خیز ان کی نگاہیں برق پاش

وہ فروغ آتش رخ جس کے آگے آفتاب
اس طرح جیسے کہ پیش شمع پروانے کی لاش

جب یہ صورت تھی تو ممکن تھا کہ اک برق بلا
دست سیمیں کو بڑھاتی اور میں کہتا دور باش

دونوں جانب تھا رگوں میں جوش خون فتنہ زا
دل ہی تھا آخر نہیں برف کی کوئی یہ قاش

بار بار آتا ہے اکبر میرے دل میں یہ خیال
حضرت سید سے جا کر عرض کرتا کوئی کاش!

درمیان قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز مے گوئی کہ دامن تر مکن ہوشیار باش

گزشتہ سطور سے یہ واضح ہو گیا کہ علماء انگریزی یا کسی دوسری زبان اور جدید علوم و فنون کے مخالف و دشمن نہ تھے بلکہ وہ چاہتے تھے کہ کالج اور یونیورسٹی کے ماحول میں جانے والے حضرات فکری اور اعتقادی طور پر گمراہی کا شکار نہ ہوں اور ایک موقع پر تو یہاں تک ہوا کہ محسوس ہونے لگا کہ یہ دونوں تعلیمی تحریکیں جو مختلف دھاروں کی شکل میں بہہ رہی

ہیں باہم مل کر ایک ہی رخ اختیار کرلیں۔ اس کا ثبوت وہ پیشکش ہے جس کے ذریعہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کو اس ادارہ کے اسلامی اور دینی شعبہ کے نگران کے طور پر بلایا گیا۔ مولانا خود تشریف نہ لاسکے تو اپنے قریبی عزیز اور تربیت یافتہ مولانا عبداللہ انصاری کو اس مقصد کے لیے بھیج دیا اور اس کا ثبوت وہ تجویز بھی ہے جو کچھ عرصہ بعد مولانا نانوتوی کے خصوصی شاگرد اور رفیق یافتہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کی طرف سے پیش ہوئی۔ دیوبند کے ۱۹۱۰ء کے جلسۂ تقسیم اسناد کے موقع پر علی گڑھ کے شیخ الجامعہ سید محمود تشریف فرما تھے۔ دونوں اداروں کے فضلاء کے باہمی تبادلے کی تجویز مولانا محمود حسن نے پیش کی۔ دوسری طرف سے اس کا خیر مقدم ہوا اور کچھ عرصہ تک اس پر عمل بھی ہوتا رہا۔

لیکن ایک سوال بجا طور پر سامنے آتا ہے کہ علماء کرام جو بساط پر قدیم تعلیمی ورثہ کو سنبھالنے کے ساتھ ملک کی آزادی کے لیے بھی سرگرم عمل تھے۔ انھوں نے دور حاضر کے اس چیلنج کو خود کیوں قبول نہ کیا اور اپنے اداروں میں کیا مشکل تھی کہ انھوں نے جدید علوم وفنون کو اپنے نصاب کا حصہ نہ بنایا۔ مولانا نانوتوی کے متعلق روایت نقل کی۔ دیوبند کے پہلے صدر مدرس مولانا محمد یعقوب نانوتوی نے کہ سفر حج پر جب ان کی ملاقات جہاز کے یورپین گورنر سے ہوئی تو وہ بہت متاثر ہوا۔ مولانا نے اس خواہش وعزم کا اظہار کیا کہ ہم واپس جاکر یہ زبانیں سیکھیں گے تاکہ زیادہ بہتر طور پر اسلام کا پیغام اور اس کی دعوت پیش کرسکیں۔

اس روایت کو جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کے صدر شعبہ اسلامیات مولانا مناظر احسن گیلانی نے بھی سوانح قاسمی" میں نقل کیا تو پھر سوال یہ ہے کہ مولانا نانوتوی نے اس سلسلہ کو آگے کیوں نہ بڑھایا؟ وہ دیوبند کے مدرسہ کے ہی نہیں اس پوری تحریک کے فکری راہنما تھے، ان کے لیے ایسا مشکل نہ تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ مولانا اسی سفر میں بیمار ہوئے۔ واپسی پر مہلت حیات زیادہ نہ ملی اور اس دنیا سے وہ چل بسے۔ یہ بات ٹھیک ہے لیکن سوال یہ ہے کہ ان کے اخلاف اور جانشینوں نے اس طرف توجہ کیوں نہ دی؟ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً ایسے رجال کار پیدا ہوتے جو ایک طرف قرآن وحدیث اور فقہ وکلام کے ماہر اور اسپیشلسٹ ہوتے تو دوسری طرف وہ جدید دنیا کے افکار سے بخوبی واقف ہوکر انہی کی زبان میں ان پر نقد وجرح کرسکتے۔

اب تک ایسا نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ اب جب کہ ہم ایک آزاد نظریاتی ریاست میں جی رہے ہیں تو اب بھی علماء نے اپنے نصاب پر نظر ثانی اور کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں کی بلکہ اگر کسی طرف سے ایسی تجویز آتی ہے تو اس پر غیظ وغضب کا اظہار کیا جاتا ہے۔ ہماری گستاخی معاف! یہ خوگر حمد کا گلہ ہے کہ ہم یہ بات کہہ رہے ہیں کہ اگر سرسید احمد خان، ان کے رفقاء اور اخلاف نے یک طرفہ ٹریفک کا اہتمام کیا تو ایسا ہی کام حضرات علماء نے کیا۔ علماء کرام کو یہ شرف حاصل تھا کہ وہ آزاد ماحول میں اداسے چلا رہے تھے، قوم کا غریب

اور متوسط طبقہ ان کی ہر آواز پر لبیک کہتا اور ان کی ہر اپیل پر اپنا خون جگر تک پیش کر دیتا، ایسے باعزم اور باہمت عوام کے تعاون کے ہوتے ہوئے علما جیسے ذمہ دار طبقہ کے لیے اپنی درس گاہوں میں ان علوم اور زبانوں کی تدریس کا اہتمام کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اس کی اہمیت کا احساس نہیں کیا اور اگر انھوں نے اس کا احساس کیا ہوتا اور ایسے "ہمہ صفت موصوف رجال کار" تیار کیے ہوتے تو آج ہمارے انتظامی، عدالتی اور زندگی کے دوسرے شعبوں کا یہ حال نہ ہوتا۔

انگریزی دور کے بعد اب بھی حکومتیں تو اسی پر ادھار کھائے بیٹھی ہیں کہ وہ اسی فرد کو عہدہ و منصب بخشیں گی جس کے پاس کالج و یونیورسٹی کا ڈپلومہ ہو۔ کیا ہمارے دینی مدرسں کے باصلاحیت طلبہ جو ۸ سال میں ۲۲ علوم و فنون کی ۹۴ مشکل ترین کتابیں گھوٹ کر پی جاتے ہیں۔ ان کے لیے اس کے ساتھ موجودہ تعلیمی میدان میں کامیابی کیوں مشکل ہے ؟ ہمیں یقین ہے کہ اگر مدارس اسلامیہ کے نصاب و نظام میں جدید علوم و فنون کو احسن طریقے سے شامل کر لیا جائے تو اس کے نتیجہ میں نہایت درجہ اچھے مسلمان، اچھے اہل علم، اچھے مقنن، اچھے منتظم اور اچھے منصف پیدا ہو سکتے ہیں۔ سرسید کی طرز عمل کا سارا قضیہ درست اور اس معاملہ میں علما کے خیالات کی تائید و تصویب پوری طرح کرنے کے باوصف ہم یہ کہیں گے کہ آپ سے چوک ہوئی۔ مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبید اللہ سندھی اور بعض ایسے دوسرے حضرات نے اس کوتاہی کی طرف توجہ بھی دلائی لیکن ان کی بات نہ سنی گئی۔

پچھلے معاملات پر اس سے زیادہ تبصرہ و تنقید کیے بغیر ہم بڑے دردمندانہ انداز سے اپنے قابل احترام علما سے درخواست کریں گے کہ ایک مخصوص فکر کے حامل اہل علم و دانش جو حکومتی مناصب پر فائز ہیں وہ تو دین اور دینی علوم کی بالادستی تسلیم کرنے سے رہے۔ آپ ان کے ہتھیاروں سے جو فی الحقیقت آپ کی متاع گم گشتہ ہیں، اپنے آپ کو مسلح کریں اور اس طرح ماحول پر چھا جائیں۔ ہمیں ڈر ہے کہ اگر اب بھی نصاب تعلیم کی اسی قدامت پر اصرار کیا گیا تو مستقبل نہایت درجہ تاریک شکل میں سامنے آئے گا جس کے تصور سے دل دہل جاتا ہے۔

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافہ اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقہ کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

قندِ مکرر

مولانا مودودی مرحوم اور مسئلہ بیعت

زیرِ نظر شمارے کے صفحہ ۲۶ پر مولانا محی الدین لکھوی صاحب مدظلہٗ کے خط میں مسئلہ بیعت کے ضمن میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا ذکر آیا تھا۔ اس سلسلے میں گذشتہ سال ماہنامہ میثاق میں مولانا مرحوم کا ایک خط شائع ہوا تھا۔ موضوع کی مناسبت کے پیشِ نظر اسے حکمتِ قرآن میں شائع کیا جا رہا ہے

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جو 'اسلامی تنظیم' ـــــ "حزب اللہ" کے نام سے قائم کی تھی اس کے بارے میں یہ تو یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ وہ کب ختم ہوئی اور آیا اسے کسی مرحلے پر باضابطہ ختم کرنے کا فیصلہ کیا بھی گیا یا نہیں ـــــ البتہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کی قائم کردہ "جماعتِ اسلامی" کی حیثیت اسی کے بروز یا ظہورِ ثانی کی ہے ـــــ

مولانا آزاد کی 'حزب اللہ' کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ اس کی اساس 'بیعت' پر تھی جبکہ 'جماعتِ اسلامی' ایک دستوری تنظیم ہے جس میں کم از کم نظری طور پر معاملات کی اصل باگ ڈور اس کے ارکان کے ہاتھوں میں ہے ـــــ اس ضمن میں ایک دلچسپ سوالیہ نشان مولانا مودودی مرحوم کے ایک خط سے سامنے آیا ہے جو انہوں نے مارچ ۱۹۴۱ء میں حیدرآباد (دکن) کے مولانا محمد یونس صاحب کے نام تحریر کیا تھا۔ (جو ان کی مرتب کردہ کتاب "یادوں کے خطوط" میں شامل ہے جو اسی سال 'اسلامی مکتبہ۔ حیدرآباد دکن' نے شائع کی ہے) اس خط سے مولانا کا جو ذہن سامنے آتا ہے وہ تو یہ ہے کہ "نبی اکرمؐ جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بار امت پر چھوڑ گئے ہیں ....." اس کے لئے جو بھی جماعت یا تنظیم قائم ہو اس کی اساس 'بیعت' پر ہونی چاہیئے ـــــ اب یہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اسی سال (۱۹۴۱ء) کے اواخر میں جب انہوں نے "جماعتِ اسلامی" قائم کی تو اس کی تشکیل کے

موقع پر 'بیعت' کے لفظ تک سے کیوں اجتناب کیا گیا!
مولانا مودودی کے خط کا متعلقہ حصّہ درج ذیل ہے ـــــ

محترمی و مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ کا عنایت نامہ ملا۔ اصطلاح میں بیعت سے مراد اطاعت اور پیروی کا اقرار ہے۔ اس کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ وہ بیعت جو کسی خاص موقع پر کسی خاص معاملہ کے لئے ہو۔ جیسے بیعت الرضوان تھی کہ حضرت عثمانؓ کی شہادت کی افواہ سُن کر حضورؐ نے اہلِ مکّہ سے جنگ کا ارادہ فرمایا اور اس وقت صحابۂ کرامؓ سے اس امر پر بیعت کی کہ وہ پیش آمدہ مہم میں آپؐ کے ساتھ جانفروشی کریں گے۔

۲۔ دوسری وہ بیعت جو تزکیۂ نفس اور اصلاحِ اخلاق و روحانیت کی نیّت سے ایک مرشد و معلّم اس شخص سے لیتا ہے جو اس کے پاس تربیت حاصل کرنے کے لئے آئے۔ یہ وہ بیعت ہے جو بالعموم ہر شخص کو کرنی پڑتی تھی جو نبیؐ کے ہاتھ پر ایمان لاتا تھا۔ آپؐ اس سے اقرار کراتے تھے کہ شرک، زنا، چوری وغیرہ سے پرہیز کرے گا اور جو احکام خداوند تعالیٰ کی طرف سے آپؐ پہنچائیں گے ان کی اطاعت کرے گا۔ اس بیعت کے لینے کا حق یا تو نبیؐ کو پہنچتا ہے یا اس شخص کو جو نبیؐ کے طریقہ پر ہو۔ یعنی طریقۂ نبویؐ کا صحیح علم بھی رکھتا ہو۔ اس پر خود بھی عامل ہو اور بیعت لینے سے اصلاح و ارشاد کے سوا قطعاً دوسری نیّت نہ رکھتا ہو۔

۳۔ تیسری بیعت وہ ہے جو جماعتِ اسلامی کے امیر یا امام کے ہاتھ پر کی جاتی ہے اور اس کی نوعیّت یہ ہے کہ جب تک امیر یا امام اللہ اور رسولؐ کا مطیع ہے اس وقت تک جماعتِ اسلامی کے تمام ارکان پر اس کی اطاعت فرض ہے

من مات ولیس فی عنقہ بیعۃ مات میتۃ جاھلیۃ

اور دوسری تمام احادیث میں جس بیعت کی اہمیت پر زور دیا گیا ہے ان میں بیعت سے مراد تیسری بیعت ہے۔ کیونکہ اس پر جماعتِ اسلامی کی زندگی اور اس کے نظم کا قیام منحصر ہے۔ اس سے الگ ہونے یا الگ رہنے کے معنی یہ ہیں کہ نبیؐ جس کام کے لئے تشریف لائے تھے اور جس امرِ عظیم کا بارِ امّت پر چھوڑ گئے ہیں اس کو نقصان پہنچایا جائے یا ختم کر دیا جائے۔

نقد و نظر

ایک غلط اجتہاد

حکمت قرآن کے شمارہ نومبر ۱۹۸۴ء میں جناب چودھری محمد رفیق صاحب کا مضمون قتل خطا میں عورت کی دیت کا مسئلہ نظر سے گزرا۔ انہوں نے اپنے مضمون میں شریعت اسلامیہ کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ لیکن مضمون کے آخر میں ان سے ایک عجیب علمی غلطی ہوئی ہے۔ اور وہ یہ کہ انہوں نے پہلے اپنے مضمون میں قتل خطا کے بارے میں عورت کی دیت کے نصف ہونے پر حدیث کے ساتھ اجماع بھی نقل کیا ہے اور پھر آخر میں انہوں نے لکھا ہے۔ "البتہ موجودہ حالات میں ایک اجتہاد ممکن ہے۔ اور شریعت اسلامیہ میں اسکی پوری پوری گنجائش ہے اور یہی اصل قانون اسلامی ہے۔ تاہم اگر کوئی ایسی عورت قتل ہو جائے۔ جو اپنے خاندان کی واحد کفیل ہو۔ یا اس کے مرجانے سے خاندان کو بہت زیادہ مالی دشواری کا سامنا ہو تو ایسی صورت میں قاضی کو یہ اختیار ہونا چاہیئے۔ کہ وہ اپنی صوابدید سے عورت کی نصف دیت کے علاوہ مزید نصف دیت تک (مرد کی دیت کے برابر) کا اضافہ کر سکے۔ اور قتل خطا کے مرتکب فرد کی عاقلہ پر اس پوری دیت کو واجب الادا قرار دے سکے۔"

اور یہ ایک عجیب علمی غلطی ہے۔ اس لئے کہ اجماع کے خلاف اجتہاد سرے سے جائز نہیں چنانچہ علامہ تفتازانیؒ تلویح میں لکھتے ہیں۔ نعم یشترط ان یعرف اقوال المجتهدين فى المسائل القياسية لئلا يقع فى مخالفة الاجماع ص۴۹ البتہ مسائل قیاسیہ میں اقوال مجتہدین کا جاننا ضروری ہے۔ تاکہ اجماع کا خلاف لازم نہ آئے۔ اور اس طرح یہی علامہ تفتازانی باب الاجتہاد میں لکھتے ہیں۔ وكان الاولى ذكر الاجماع ايضا اذ لا بد من معرفة مواقعه لئلا يخالفه فى اجتهاده ص۲۰۴ اور اجماع کو ذکر کرنا چاہیئے تھا کیونکہ اجماع اور مواقع اجماع کی معرفت مجتہد کے لئے ضروری ہے تاکہ اجماع کی مخالفت میں نہ پڑ جائے اور حاشیہ توضیح میں ہے۔ لاجل ذالك وقع من بعض المجتهدين المخالفة للاجماع فرد بذالك اجتهادهم اور اسی وجہ سے جب بھی

بعض مجتہدین سے اجماع کا خلاف آیا ہے۔ تو ان کا اجتہاد مسترد کیا گیا ہے اور نورالانوار میں ہے وانما یحتاج الیہ لان یعلم المسائل الاجماعیہ فلا یجتھد فیھا بنفسہ ص۲۵۰ اور اجماع کا علم اس لئے ضروری ہے۔ تاکہ مسائل قیاسیہ کو جان لے۔ اور پھر اس میں از خود اجتہاد نہ کرے۔ اور قمرالاقمار میں ہے قولہ فلا یجتھد فیھا کیلا یفتی بخلاف الاجماع از خود اجتہاد اس لئے نہ کریگا۔ تاکہ اجماع کے خلاف فتوی نہ دے۔

اور اس کا قیاس اور اجتہاد ایک اور اصولی قاعدہ کی رو سے بھی صحیح نہیں ہے اور وہ یہ ہے کہ قیاس کے لئے یہ شرط ہے کہ فرع میں نص موجود نہ ہو۔ چنانچہ صاحب نورالانوار لکھتے ہیں والرابع عدم وجود النص فی الفرع ص۲۳۳ اور چوتھی شرط یہ ہے کہ فرع میں نص موجود نہ ہو۔ اور اس شرط رابع پر صاحب منار کی تفریع کے تحت صاحب نورالانوار تحریر فرماتے ہیں۔ لانہ لا یحتاج الی القیاس مع وجود النص ص۲۳۵ کیونکہ نص کے ہوتے ہوئے قیاس کی کوئی حاجت نہیں۔ اور چودھری صاحب مرد کو اصل اور عورت کو فرع ٹھہراتے ہیں۔ اور عورت کو مرد پر قیاس کرتے ہیں حالانکہ عورت میں خود نص موجود ہے اور وہ وہ حدیث ہے جس کو انہوں نے خود کتاب السنۃ سے حکمت قرآن کے ص۱۵، ۱۶ پر نقل کیا ہے تو فرع میں نص کے موجود ہونیکی وجہ سے اس کا قیاس باطل ہے۔ لہذا اسکے اس قول کے لئے کہ "اور شریعت اسلامیہ میں اسکی پوری پوری گنجائش ہے" صحت کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ قول اصول فقہ سے غفلت برتنے کی وجہ سے سرزد ہوا ہے۔

اور اس کے علاوہ انکے اجتہاد کی وجہ سے اس حدیث اور اجماع کا (جو عورت کی دیت کے بارے میں ہے) تقریبًا تقریبًا اہمال لازم آتا ہے۔ کیونکہ آج بہت سی عورتیں مختلف قسم کی نوکریوں پر ہیں اور بعض تو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسی عورتوں کے مرجانے سے خاندان کو بہت زیادہ مالی دشواری کا سامنا کرنا پڑیگا۔ اسی طرح فاحشہ عورتیں اپنے خاندان کے لئے بہت زیادہ کمائی کرتی ہیں۔ اور بعض علاقوں میں عورتیں لاکھوں روپیہ پر بیچی جاتی ہیں۔ یہ اگرچہ شرعًا جائز نہیں ہے۔ لیکن انکا خاندان تو کہے گا۔ کہ انکے مرجانے سے ہم کو بہت زیادہ مالی دشواری کا سامنا ہوا ہے۔ لہذا محمد رفیق چودھری کے اجتہاد کے مطابق ہمارے لئے مرد کی پوری دیت واجب الادا قرار دی جائے۔

لہذا حدیث اور اجماع کے اندر بہت کم عورتیں رہ جائینگی اور یہ بلا دلیل تقریباً تقریباً حدیث اور اجماع کا ابطال ہے۔ جو بالکل جائز نہیں۔ اور اس طرح اسکی تعلیل کے پیش نظر ایک اور مفسدہ بھی لازم آتا ہے وہ یہ کہ اگر ایسا مرد مر جائے جس کے مر جانے سے خاندان کو بہت زیادہ مالی دشواری کا سامنا نہ پڑتا ہو۔ بلکہ الٹا وہ خاندان پر بوجھ ہو۔ اسکی دیت بھی مرد کی دیت کے برابر نہ ہونا چاہیئے۔ بلکہ نصف دیت ہونا چاہیئے۔ اور اس مفسدہ کی رو سے اس کا قیاس ایک اور طریقہ سے بھی غلط ثابت ہوتا ہے وہ یہ کہ اس کے قیاس کی وجہ سے اصل کا حکم متغیر ہوا اور اس طرح کا قیاس غلط اور باطل ہوتا ہے۔ چنانچہ صاحب منار شرائط قیاس میں لکھتے ہیں۔ والشرط الرابع ان یبقیٰ حکم النص بعد التعلیل علی ما کان قبلہ۔ اور چوتھی شرط یہ ہے کہ حکم نص بعد از تعلیل علی ما کان قبلہ باقی رہیگا اور اسکے تحت صاحب نور الانوار لکھتے ہیں۔ ومعنیٰ بقاء حکم النص ان لا یتغیر عما کان علیہ سوی انہ تعدی الی الفرع فعم ص ۲۳۵ بقاءِ حکم النص کا معنی یہ ہے کہ حکم کے حالاتِ سابقہ میں کوئی تغیر نہ آجائے۔ بغیر اسکے کہ وہ فرع کو متعدی ہو کر عام بنا اور یہ سب کچھ میں نے اس بنیاد پر لکھا کہ اس بات کو علت تسلیم کیا جائے کہ عورت کی ہلاکت خاندان کے لئے اتنی مالی پریشانی کا باعث نہیں بنتی جتنا کہ مرد کی ہلاکت، لیکن حقیقت یہ ہے۔ کہ یہ علت نہیں یہ حکمت ہے۔ جیسا کہ چودھری صاحب نے خود اس کا اقرار کیا ہے اور علت و حکمت میں فرق واضح ہے۔ علت پر حکم کا مدار ہوتا ہے۔ حکمت پر حکم کا مدار نہیں۔ نیز یہ حکمت بھی ایسی ہے۔ جس کا ثبوت کہیں بھی قرآن وحدیث سے ثابت نہیں۔

لہذا اس غیر منصوص حکمت کو علت ٹھہرا کر ایک ایسی اصولی غلطی کی ہے جسکو ذی عقل اور صاحب علم انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے۔

حررہ سیف اللہ عفا اللہ عنہ استاذ جامعہ ارشاد آباد تحصیل ٹانک ڈیرہ اسماعیل خان

آپ کے احباب کے لیے :

بہترین تحفہ

ڈاکٹر اسرار احمد کی مقبولِ عام تالیف

مُسلمانوں پر
قرآن مجید کے حقوق

خود پڑھیے اور دوستوں اور عزیزوں کو تحفتہً پیش کیجیے۔
دورانِ ماہِ رمضان اہل و عیال اور اعزّہ و اقارب کے ساتھ اجتماعی مطالعہ کیجیے

نوٹ

اِس کتابچے کا انگریزی اور عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے ، فارسی ترجمہ زیرِ طباعت ہے ۔ اِس کے حقوقِ اشاعت نہ ڈاکٹر صاحب کے حق میں محفوظ ہیں نہ انجمن کے !

شائع کردہ

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ماہِ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک خطبہ دیا۔ اس میں آپؐ نے فرمایا:

"اے لوگو! تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے۔ اس مبارک مہینہ کی ایک رات (شبِ قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس مہینے کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کیے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہِ خداوندی میں کھڑا ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے)۔ جو شخص اس مہینے میں اللہ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوئی غیر فرض عبادت (یعنی سنّت یا نفل) ادا کرے گا تو اس کو دوسرے زمانے کے فرضوں کے برابر اس کا ثواب ملے گا اور اس مہینے میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنّت ہے۔ یہ ہمدردی [illegible] کا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ [illegible] نے اس میں کسی [illegible] اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے [illegible] تو اس کے گناہوں [illegible] اور آتشِ دوزخ سے آزادی [illegible] کے برابر ثواب [illegible] گا، بغیر اس کے کہ روزہ [illegible] ۔ آپؐ سے عرض [illegible] رسول اللہ! ہم میں سے [illegible] حاصل نہیں ہوتا [illegible] اس ثواب سے محروم [illegible] نے یہ ثواب اس [illegible] گا جو دودھ [illegible] کے ایک گھونٹ پر [illegible] افطار کرا دے [illegible] وسلم نے سلسلۂ کلام جاری [illegible] نے فرمایا [illegible] کھلا دے، اس کو اللہ تعالیٰ [illegible] یعنی کوثر [illegible] اس کو کبھی پیاس ہی نہیں [illegible] آپؐ نے فرمایا، اس ماہِ مبارک کا [illegible] اور آخری حصہ آتشِ دوزخ [illegible] جو آدمی اس مہینے میں اپنے غلام و [illegible] اس کی مغفرت فرمائے گا اور اس کو [illegible]

[illegible] محدّث مولانا محمد منظور نعمانی)

Regd. L. No. 8193

HIKMAT-I-QURAN MONTHLY LAHORE

Vol. 4 | MAY 1985 | No. 3

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاھور

کے قیام کا مقصد

منبع ایمان ——— اور ——— سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے علم و حکمت کی

وسیع پیمانے ——— اور ——— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں تجدیدِ ایمان کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ——— اور ——— غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ